جولائی / اگست ۱۹۸۷ء

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
ہدایتُ القرآن (۱۶)	مولانا محمد تقی امینی	۳
درسِ قرآن (سورۂ محمدؐ، قسط [illegible])	ڈاکٹر اسرار احمد	۷
خدمتِ قرآن کے میدان	پروفیسر حافظ احمد یار	۲۳
دو البیانی مفکرین کا تقابلی جائزہ	ڈاکٹر ابصار احمد	۳۵
منشورِ اسلام (۵)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۴۳
حکمتِ اقبال (۵)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۵۳
پرویز صاحب کے افکار کا شجرۂ نسب	عبدالکریم عابد	۷۰
جہاد فی سبیل اللہ اور ہماری ذمہ داریاں	لطف الرحمٰن خان	۸۷
اراکینِ انجمن کی خدمت میں چند گزارشات	لطف الرحمٰن خان	۹۵
تبصرۂ کتب	ادارہ	۱۰۱

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

	اشاعت عام	اعلیٰ
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	2.00	6.00
راہِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	2.00	5.00
قرآن حکیم کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ		10.00
مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب		12.00
قرآن اور امن عالم		2.00
دعوت الی اللہ		2.00
رسول کامل ﷺ		6.00
نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت	3.00	5.00
نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں		4.00
معراج النبی ﷺ		3.00
شہید مظلوم (حضرت عثمان ذوالنورین رضؓ)	2.00	5.00
سانحہ کربلا (شہادت حسینؓ کا اصل پس منظر)	2.00	4.00
اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام		2.00
اسلام میں عورت کا مقام	5.00	8.00
عظمت صوم		2.00
عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی		4.00
اسلام اور پاکستان		5.00
استحکام پاکستان		30.00
علامہ اقبال اور ہم		20.00
شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک		3.00
اسلام کا معاشی نظام		4.00
دعوت رجوع الی القرآن		6.00

وَمَن یُؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا

(البقرۃ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ۔ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی۔

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر: اقتدار احمد

جلد ۶ | جولائی، اگست ۱۹۸۷ء مطابق ذوالقعدہ و ذوالحجہ ۱۴۰۷ھ | شمارہ ۷، ۸

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس: ۱۰ داؤد منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۲۵۸۶

سالانہ زر تعاون -/۴۰ روپے فی شمارہ -/۴ روپے

مطبع: مکتبہ جدید پریس لاہور

اس شمارے کی قیمت -/۷ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

"حکمتِ قرآن" کا یہ شمارہ جولائی و اگست ۸۶ء کی مشترک اشاعت پر مشتمل ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ اس طرح کی دوماہی اشاعت قارئین کے لئے ذہنی کوفت کا باعث ہوتی ہے، اور ہم اس پر پیشگی اظہارِ معذرت بھی کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہمارے لئے اس امر کا یہ پہلو قدرے اطمینان بخش ہے کہ ایسا "ناخوشگوار" معاملہ اب ایک قابلِ ذکر وقفے کے بعد پیش آیا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال کے دوران پرچے کی اشاعت میں بے قاعدگی اس درجے ہوگئی تھی کہ پورے سال میں کل سات شمارے شائع ہوسکے تھے گویا دوماہی مشترک اشاعت ایک معمول کا درجہ اختیار کرچکی تھی۔ لیکن الحمدللہ کہ نومبر ۸۶ء کے شمارے سے لیکر، جس میں ہماری جانب سے "عزمِ جدید" کا اظہار کیا گیا تھا، جون ۸۷ء کے شمارے تک مسلسل آٹھ ماہ "حکمتِ قرآن" باقاعدگی سے ہر ماہ شائع ہوتا رہا ہے گو اشاعت میں تاخیر کی شکایت پورے طور پر رفع کرنے میں ہمیں کامیابی نہیں ہوسکی لیکن اس دوران پرچے کے ظاہری اور معنوی دونوں نوع کے حُسن میں نمایاں اضافہ اس کوتاہی کی کسی قدر تلافی کردیتا ہے۔ ہم قارئین کو یقین دلاتے ہیں کہ اشاعت میں ایسی بے قاعدگی، ان شاءاللہ، اب معمول کا درجہ اختیار نہیں کریگی۔ بلکہ توقع ہے کہ حکمتِ قرآن کا یہ مشترک شمارہ "رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور!" کے مصداق آئندہ کے لئے اشاعت میں تاخیر کی شکایت کے ازالے کا ذریعہ بن جائے گا۔

زیرِ نظر شمارے میں درس سُورۃ محمدؐ کی جو قسط شائع ہوئی ہے اُس میں لونڈی غُلاموں کے مسئلے پر اُس مفصّل بحث کی تکمیل ہوگئی ہے جس کا آغاز دو اقساط قبل اِس سُورۃ مُبارکہ کی آیت ۴ کے مطالب کی توضیح کے سلسلے میں ہوا تھا۔

(باقی ص ۱۰۴ پر)

ہدایت القرآن (۱۶)

مولانا محمد تقی امینی

قوم بنی اسرائیل کی احسان فراموشی و گمراہی

گذشتہ سے پیوستہ

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ ... تا ... وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ

اور جب ہم نے تمہارے راستہ کے لئے سمندر کو پھاڑ دیا[1] تو پھر تمہیں تو نجات دی اور تمہارے دیکھتے دیکھتے فرعونیوں کو غرق کر دیا[2]۔

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لئے سمندر میں راستہ ہو جانا اور خیر و خوبی کے ساتھ گذر جانا ان کے دشمنوں کے لئے راستہ نہ ہونا اور ان کا ہلاک و برباد ہو جانا بلاشبہ تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے۔ جس پر یہود ی فخر کرتے تھے۔ قرآن نے اسی واقعہ کو یاد دلا کر یہ دکھایا ہے کہ جب کسی قوم کا ظلم و ستم حد سے بڑھ جاتا ہے تو اس کی ہلاکت و بربادی اور مظلوم قوم کے اس سے نجات پانے کی ایسے ہی عجیب و غریب شکل اختیار کی جاتی ہے جس سے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ اور ظاہری طور پر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ یہ واقعہ بحر قلزم میں ہوا تھا۔ دریائے نیل سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

[2] محکمہ موسمیات و جغرافیہ کے ماہرین اس واقعہ کی جو بھی وجہ بیان کریں یا سمندر کے جس حصہ سے بھی اس کا تعلق جوڑیں نہ مومن کے ایمان میں کوئی کمی آتی ہے اور نہ اس واقعہ کے معجزہ ہونے میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ مثلاً موسمیات والے کہتے ہیں کہ رات بھر زوردار پوربی ہوا چلی جس سے سمندر کا پانی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور درمیان میں راستہ ہو گیا یا جوار بھاٹا کی شکل پیدا ہوئی جس سے پانی کے دو حصے ہو گئے۔ اور درمیان میں راستہ ہو گیا۔ قدیم جغرافیہ والے کہتے ہیں کہ سمندر اس زمانے میں آج کی طرح لق و دق نہ تھا بلکہ اس میں چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی تھے جو کبھی غائب ہو جاتے اور کبھی موجود ہو جاتے تھے۔ پھر یہ راستہ سمندر میں نہ ہوا تھا بلکہ اس کے ایک شاخ میں ہوا تھا جو سمندر کے بائیں جانب (جنوب میں) تقریباً دو میل چوڑائی میں تھی۔ قرآن

کو ان سب سے بحث نہیں ہے۔ بحث صرف اس سے ہے کہ ایک مظلوم قوم نہایت کس مپرسی کی حالت میں ظالم قوم کے شکنجہ میں پھنسی ہوئی تھی اور اس سے نجات پانے کی انسانی تدبیریں فیل ہو چکی تھیں لیکن قانون قدرت کے مطابق مظلوم کی نجات اور ظالم کی ہلاکت کا وقت آگیا تھا جس کے لئے قدرت نے وہ تدبیر اختیار کی جو غیر معمولی حیرت انگیز اور انسان کے بس سے باہر تھی۔ یہ تدبیر قانونِ قدرت کے مطابق اور سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تھی لیکن لوگوں کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس بنا پر یہ واقعہ معجزہ قرار پایا۔ جس سے ہمارے ایمان کو ہمیشہ تازگی ملتی رہے گی۔

قرآن میں انبیاء علیہم السلام سے متعلق بہت سے غیر معمولی اور حیرت انگیز واقعات (معجزات) ذکر کئے گئے ہیں جن کا انکار کیا جاتا ہے یا ان کا ایسا مطلب بیان کیا جاتا ہے جو قرآن کے بیان سے مناسبت نہیں رکھتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کو قانون قدرت اور اللہ کی عادت کے خلاف سمجھا جاتا ہے جبکہ ان دونوں کے بارے میں طے شدہ ہے کہ ان کی خلاف ورزی یا ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ آگ جلاتی ہے یہ قدرت کا قانون ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس نے نہیں جلایا یہ قانون کی خلاف ورزی ہے۔ پانی ڈبوتا ہے یہ قدرت کا قانون ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نہیں ڈبویا۔ یہ قانون کی خلاف ورزی ہے۔ جب اللہ کی عادت خلاف کرنے کی نہیں ہے تو ان واقعات (مثلاً) میں ایسا کیوں ہوا؟ بجائے اس کے کہ اس "کیوں" کا جواب تلاش کیا جاتا ان واقعات کا انکار کر دینے ہی میں آسانی نظر آئی یا ان کا ایسا مطلب بیان کیا گیا جو قرآن کے بیان سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

مذکورہ آیت میں اسی غلطی کی اصلاح کی گئی ہے اور اس میں دو قسم کے قانونِ قدرت بیان کئے گئے ہیں۔ ایک وہ جو لوگوں کو معلوم ہیں کہ پانی بوجھل چیز کو ڈبو دیتا ہے جیسا کہ اس نے فرعونیوں کو ڈبویا اور دوسرے وہ جو لوگوں کو معلوم نہیں کہ پانی کبھی نہیں ڈبوتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کو نہیں ڈبویا۔ اس آیت میں دونوں قسم کے قانونِ قدرت کو جمع کر دیا گیا ہے۔ پہلے کا ذکر اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ (ہم نے فرعونیوں کو غرق کر دیا) میں اور دوسرے کا ذکر اَنْجَيْنٰكُمْ (ہم نے موسیٰ اور ان کی قوم کو نجات دی) میں ہے۔

پہلی قسم کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہے اور اس کے مطابق دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ لیکن دوسری قسم کے قانون کا ذکر بھی کم جگہ نہیں ہے جس کے ذریعہ دنیا کے نظام پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔

قرآن میں جہاں کہیں اللہ کی مشیت اور اس کے ارادہ کا ذکر ہے اور اس کی برتری دبا دستی بیان ہوئی ہے۔ ان سب جگہ انہی دوسرے قسم کے قوانین کی طرف اشارہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی مشیت (کسی بات یا کام کو چاہنا) اور ارادہ (کسی بات یا کام کا ارادہ کرنا) بغیر سوچے سمجھے اٹکل میں تیر چلانا نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک نظم و ضبط اور قاعدہ و قانون کے تحت ہوتا ہے جن تک ہماری پہونچ نہیں ہو پاتی ہے۔

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ قانون قدرت کے بارے میں جتنا وہ جانتا ہے اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ اور جو کچھ ہے اس کو قانون قدرت کے خلاف سمجھ کر انکار کر دیتا ہے۔ حالانکہ دن بدن علم میں اضافہ کے ساتھ قانون قدرت کے علم میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ہر نئی دریافت کے وقت بے اختیار انسان کی زبان سے نکل پڑتا ہے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (اللہ بڑی برکت والا سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے۔)

قانونِ قدرت کے بارے میں جس قدر انسان کو معلوم ہے وہ تجربہ مشاہدہ اور تحقیق سے ہے۔ جن کا سلسلہ کہیں بند نہیں ہوتا ہے۔ اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ جس قدر قانون قدرت کی اب تک دریافت ہوئی ہے اس کے علاوہ بھی قانونِ قدرت موجود ہیں۔ پہلے جب تک ریسرچ و تحقیق کا کام آگے نہیں بڑھا تھا ان غیر معمولی اور حیرت انگیز واقعات (معجزات) کو ثابت کرنے کے لئے فلسفیوں کے نظریات سے سہارا لیا جاتا تھا پھر بھی ان کو خرقِ عادت (اللہ کی عادت کے خلاف) کا نام دیا جاتا تھا۔ لیکن اب بات اتنی زیادہ آگے بڑھ گئی ہے کہ نہ فلسفیوں کی رایوں سے مدد لینے کی ضرورت ہے اور نہ ان کو خرقِ عادت (عادت کے خلاف) قرار دے کر قانون قدرت سے مستثنیٰ کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ ان (معجزات) کی ایک جامع تعبیر کی ضرورت ہے کہ ان کا تعلق قانون قدرت کی اس دوسری قسم سے ہے جس کا علم ہمیں نہیں ہے۔ نہ کسی سے مرعوب ہونے کی ضرورت ہے اور نہ کسی کے ڈر سے ایسا مطلب بیان کرنے کی ضرورت ہے جو قرآن کے بیان سے مناسبت نہ رکھتا ہے۔ اب وہ زمانہ گیا جبکہ قرآنی حقائق کو ثابت کرنے کے لئے معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا جاتا تھا۔ اب وہ زمانہ آگیا کہ اس "انداز" پر معذرت کرنا پڑے گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک پھول کے بیج سے قانونِ قدرت کے مطابق ایک ہی قسم کے

پھول پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس میں تبدیلی نہیں ہوتی لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسی 'بیج' سے ایک علیحدہ قسم کا پھول (SPROUT) پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ جینئس (GENIUS) کی صفت انسان میں پیدائشی و موروثی ہوتی ہے۔ اگر یہ صفت رفتہ رفتہ نسل و خاندان کے شخص میں ایک دم سے کوئی جینئس (GENIUS) بناتا ہے اور باپ دادا میں کوئی نشانی نہیں ملتی ہے تو نہ قدرت کا یہ حیرت انگیز قانون سمجھ میں آتا ہے اور نہ کسی میکانکی عمل کے دائرہ میں آتا ہے۔ یہ دونوں غیر معمولی اور حیرت انگیز واقعات موجود ہیں لیکن جس قدر قانونِ قدرت ہمیں معلوم ہیں یہ واقعات ان کے مطابق نہیں ہیں جب یہ بات طے ہے کہ کوئی واقعہ قانون قدرت کے خلاف نہیں ہوتا ہے تو لامحالہ کچھ اور قوانین قدرت ماننے پڑیں گے جن کے مطابق یہ واقعات ہوتے ہیں اور قانون قدرت کے خلاف ہونے کی نہیں لازم آتی۔

راقم الحروف نے اپنی کتاب "تہذیب کی تشکیل جدید" میں لکھا ہے کہ:

"معجزات دوسرے عالم کے قوانین اس عالم پر اثر انداز ہونے سے ظاہر ہوتے ہیں اس عالم میں چونکہ اثر اندازی کے فلسفہ سے واقفیت نہیں ہوتی اس بنا پر معجزات کو "عجائبات" میں شمار کیا جاتا ہے۔ ورنہ حقیقتہً نہ ان میں کوئی عجوبہ ہوتا ہے اور نہ وہ قانونِ قدرت کے خلاف ہوتے ہیں"۔ (ص ۱۲۸)

انہیں دوسرے عالم کے قوانین کو قانونِ قدرت کی دوسری قسم قرار دیا گیا ہے جن کے تحت معجزات ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر ہمیں دونوں قسم کے قوانین کا علم ہو جائے تو پھر خلاف ورزی کی بات بے معنی ہو کر رہ جائے۔ یہ قرآن کا بجائے خود بہت بڑا معجزہ ہے کہ اس نے معجزات کے ذریعہ اور دوسری آیتوں کے ذریعہ ان قوانین (دوسری قسم) کی خبر دی جن کے ذریعے دنیا کے نظام اور اس میں جاری قانون پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔ جن سے اب انکار کرنا محال ہے اور معجزات کو ان قوانین کے لئے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ جس طرح قرآن میں زندگی کے اصول بیان کئے گئے اور کچھ جزئیات بطور نمونہ ذکر کی گئی۔ اسی طرح قرآن میں دوسرے قوانین ذکر کئے گئے ہیں اور کچھ معجزات بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔

درسِ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ترتیب و تسوید: جمیل الرحمٰن / عاکف سعید

گزشتہ سے پیوستہ*

سورۃ محمدؐ کی آیت نمبر ۴ پر ہم اپنی گفتگو ایک حد تک مکمل کر چکے ہیں۔ اب اس آیت سے متعلق ایک اور پہلو پر ہمیں گفتگو کرنی ہے اور ان گمراہ کن نظریات کے جنگل کو صاف کرنا ہے جو یہاں منکرین حجیت حدیث نے اگایا ہے۔ انہوں نے آیت کے اس ٹکڑے سے استدلال کیا ہے کہ "فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" "پھر (تمہیں اختیار ہے کہ) تم خواہ انہیں (یعنی اسیرانِ حرب کو) بطور احسان (رہا کر دو) یا فدیہ لے کر"۔ ان حضرات کا موقف ہے کہ قرآن نے تو یہی دو شکلیں بیان کی ہیں۔ لہٰذا قتال فی سبیل اللہ کے نتیجے میں پکڑے جانے والے کافروں کو مستقل قیدی یا غلام کیسے بنایا جا سکتا ہے! چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ غلامی کا معاملہ قرآن سے ثابت نہیں ہے بلکہ قرآن کے منشا کے خلاف ہے..... ان کے اس پورے موقف کا تانا بانا اس آیت مبارکہ میں وارد شدہ دو الفاظ پر مشتمل ہے۔ پہلا لفظ ہے "مَنّ" یعنی "احسان" اور دوسرا ہے "فِدَآءً" یعنی فدیہ..... لہٰذا ہمیں پہلے ان ہی دو الفاظ پر اپنی توجہ کو مرتکز کرنا ہو گا۔

* ربطِ مضمون کے لئے ماہ اپریل کے حکمتِ قرآن میں شائع شدہ درس سورہ محمد کی قسط ۲ کا مطالعہ فرمائیں

احسان کی مختلف شکلیں

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مفسّرین نے "منّ" یعنی احسان کی چار شکلیں بیان کی ہیں..... پہلی شکل تو یہ ہے کہ اسیران حرب کی جان بخشی کر دی جائے۔ ورنہ دستور تو یہی تھا کہ جنگی قیدیوں کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ اور پھر وہ بدبخت جو اللہ کے رسول کے مقابلے میں میدان میں نکلا ہو اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہو ان کی سزا فی الواقع اس سے کم کیا ہو سکتی تھی۔ کہ ان کی گردنیں اڑا دی جاتیں۔ چنانچہ گردن مارنے کے مقابلے میں احسان کی بلند ترین شکل تو یہ ہے کہ جان بخشی کر دی جائے..... احسان ہی کی دوسری شکل یہ ہے کہ انہیں قید میں رکھا جائے۔ اسی آیت مبارکہ میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں "فَشُدُّوا الْوَثَاقَ" "انہیں خوب مضبوطی سے باندھ کر رکھو" گردن اڑانے کے مقابلے میں یقیناً یہ بھی ایک درجے کا احسان ہے۔ ہاں اس سطح پر دین کی تعلیم یہ ہے کہ انہیں ایذا نہ دی جائے' بھوکا پیاسا نہ رکھا جائے۔ چنانچہ غزوہ بدر کے بعد جب تک فدیہ کا معاملہ طے نہیں پا گیا' اسیران بدر کو قید میں رکھا گیا اور اس دوران ان کا پورا پورا خیال رکھا گیا اور انہیں کوئی ایذا اور تکلیف نہیں پہنچائی گئی۔

احسان کی تیسری شکل یہ ہے کہ ان گرفتار شدگان کو غلام کی حیثیت دے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جان سے مار دینے کے مقابلے میں غلام بنا لینا یقیناً احسان ہی کی ایک صورت ہے۔ پھر یہ کہ اسلام نے غلاموں کو جو حقوق دیئے ہیں اور جو مقام (STATUS) عطا کیا ہے اس کا اس سے قبل کوئی تصوّر موجود نہ تھا۔ قبل اسلام معاشرے میں غلاموں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے آقاؤں کو ان کی جانوں پر اسی طرح اختیار حاصل ہوتا تھا جیسے کسی کو اپنی بھیڑ بکری پر ہوتا ہے کہ جب چاہے اسے ذبح کر دے' کوئی باز پرس نہیں کر سکتا۔

یہ بات محض ازمنہ قدیم کی نہیں ہے بلکہ انیسویں صدی کے وسط تک یورپ اور امریکہ میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ بلکہ جو کچھ امریکیوں نے اس معاملے میں کیا ہے وہ اس داستان کا تلخ ترین

باب ہے۔ کہ بغیر کسی اعلان جنگ کے 'افریقہ کے آزاد لوگوں کو باقاعدہ اس طور سے پکڑ کر لے جاتے تھے جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کو زندہ پکڑتا ہے۔ پھر انہیں بدترین غلامی سے دوچار کیا جاتا تھا۔ اسلام میں اس قسم کی غلامی کی قطعاً اجازت نہیں ہے بلکہ غلامی کی صرف ایک صورت کی اسلام نے اجازت دی ہے اور وہ یہ کہ قتال فی سبیل اللہ کے نتیجے میں کفار و مشرکین کے جو افراد گرفتار کئے جائیں صرف انہیں غلام بنایا جاسکتا ہے۔ غلامی کی ہر دیگر قسم تمام مسلّمہ مسالک فقہ کے نزدیک مطلقاً حرام ہے۔ پھر مسلمانوں نے غلاموں کو جو مقام دیا ہے اسے نظر انداز کر دینا سخت ناانصافی ہوگی۔ تاریخ اسلام میں ایک دور وہ بھی آیا کہ مشرق و مغرب میں غلام خاندانوں کی حکومتیں بنیں۔ مصر میں ممالیک کی حکومت ایک عرصے تک قائم رہی اور اسی دور میں خاندان غلاماں ہندوستان پر حکمران رہا۔ پھر ہمارے علماء سلف میں سے کتنے ہی محدثین 'فقہاء اور ائمہ مجتہدین ایسے تھے جو غلاموں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ تاریخی شواہد ہیں قصے کہانیاں نہیں ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی ذاتی رائے اور رجحان کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس معاملے کو اس کے صحیح سیاق و سباق میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے لئے اصل ماخذ یقیناً قرآن حکیم ہے۔ لیکن قرآن کے چند الفاظ کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اپنا مفہوم پہنا دینا صریح ظلم ہے۔ پھر دوسرا اہم ماخذ سنت رسولؐ ہے جو درحقیقت قرآن ہی کی تشریح و توضیح ہے۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدین کا تعامل ہے جو ہمارے لئے مشعل راہ ہے اور پھر تابعین 'تبع تابعین 'فقہائے مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی منقول آراء ہیں جنہیں نظر انداز کرنا اپنے لئے گمراہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ محض اپنی ذاتی رائے اور رجحان کو بنیاد بنا کر یا دشمنان اسلام کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر متجدّدانہ رویہ اختیار کرنا کسی طور درست نہیں۔

زیر نظر آیت پر غور کیجئے۔ سیاق کلام اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ابھی ان گرفتار شدہ مشرکین کو چھوڑنا خلاف مصلحت ہے۔ چھوڑنے کا معاملہ تو تب زیر غور آسکتا ہے جب جنگ و قتال کا یہ سلسلہ مکمل طور پر ختم ہو جائے۔ ''حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ

اَوْزَارُھَا" ابھی تو باطل کے ساتھ بھرپور کشمکش جاری ہے۔ اس مرحلے پر اگر انہیں چھوڑ دیا گیا تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ باطل کی تقویت کا ذریعہ بن جائیں۔ لہٰذا ابھی انہیں باندھ کر رکھنا ہے۔ ..... اب باندھنے کی ایک شکل تو یہ ممکن ہے کہ انہیں تعذیب خانوں (CONCENTRATION CAMPS) میں رکھا جائے۔ اس نام نہاد متمدن دور میں بھی ان کیمپوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ یہاں انسان مویشیوں کے باڑوں سے بھی بدتر حالت میں زندگی گذارتا ہے۔ لیکن اسلام کی تعلیمات یہی ہیں کہ قیدیوں سے بہتر سلوک روا رکھا جائے..... چنانچہ اسیران بدر جب تک مقید رہے ان کے ساتھ بہتری کا معاملہ کیا گیا..... لیکن اس سے بھی بہتر ایک شکل یہ ہے کہ ان قیدیوں کو اسلامی معاشرے میں جذب کر دیا جائے۔ انہیں مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے۔ گو ان کے لئے عنوان تو غلام ہی کا ہو گا لیکن ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور حسنِ معاشرت کا معاملہ کیا جائے گا۔ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ مفسّرین نے احسان کی جو چار شکلیں بیان کی ہیں' ان میں تیسری صورت یہی ہے۔ چنانچہ یہ وہ شکل ہے جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ اور ساتھ ہی تفصیلی ہدایات بھی جاری فرما دیں کہ غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کیا کرو۔ ان کو وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم پہنتے ہو۔ ان پر ان کی استطاعت اور استعداد سے بڑھ کر ذمہ داریوں کا بوجھ نہ ڈالو' وغیرہ۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنا بہت بڑا ثواب اور گناہوں کے کفارے کا ذریعہ قرار دیا۔ کتنے ہی گناہ ایسے ہیں جن کے کفارہ کے طور پر گردن کے چھڑانے یعنی غلام آزاد کرنے کا ذکر ہماری فقہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ گویا اس طور پر ذہنوں کو تیار کیا گیا کہ بتدریج غلامی کا معاملہ کم سے کم ہوتا چلا جائے۔

احسان کی چوتھی شکل جو بعد میں اختیار کی گئی' یہ ہے کہ ان مفتوحین کو انفرادی غلامی میں نہ دیا جائے بلکہ مسلمانوں کی مجموعی غلامی میں لے لیا جائے۔ مراد یہ ہے کہ ان کو ذمی بنا لیا جائے..... اب ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ ذمی سے مراد کیا ہے! ..... اصل معاملہ یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں ریاست اسلامی کا مکمل شہری (COMPLETE CITIZEN) جسے تمام حقوق حاصل ہوں' صرف مسلمان ہوتا

ہے۔ غیر مسلم اسلامی ریاست کا مکمل تنہری نہیں ہو سکتا۔ غیر مسلم کی دو حالتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کسی معاہدہ کے تحت کوئی غیر مسلم قوم اسلامی حکومت کی رعایا میں شامل ہو جائے۔ اس کے ساتھ جو بھی معاہدہ ہو گا اس کی شرائط کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔ معاہدہ کی ہر شرط پوری کی جائے گی۔ ایسے لوگ معاہد کہلائیں گے انہیں ذمی نہیں کہا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اسلامی ریاست کا ہر غیر مسلم لازماً ذمی نہیں ہوتا۔ ذمی صرف وہ ہوتے ہیں جو قتال فی سبیل اللہ میں شکست کھا کر اطاعت قبول کر لیں۔ انہیں نہ تو اب قیدی بنایا جائے گا اور نہ 'CONCENTRATION CAMPS' میں رکھا جائے گا۔ نہ ہی ان کو فرداً فرداً مسلمانوں میں بحیثیت غلام تقسیم کیا جائے گا۔ بلکہ ان کو اسلامی ریاست کا ایک کمتر درجے کا شہری (SECOND RATE CITIZEN) بنا لیا جائے گا۔ ان کے احوال شخصیہ (PERSONAL LAW) میں اسلامی ریاست کوئی مداخلت نہیں کرے گی..... ان کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق پوجا پاٹ' عبادات اور دیگر معاشرتی رسوم ادا کرنے کی مکمل آزادی ہو گی۔ وہ مسلمانوں کی طرح تجارت' صنعت و حرفت کے میدان میں حصہ لے سکیں گے۔ ان کو یہاں تک آزادی ہو گی کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا علیحدہ سے انتظام بھی کر سکیں گے۔ لیکن ملکی قانون کے معاملے میں انہیں شریعت اسلامی کی پابندی کرنی ہو گی۔ نیز ان کو اسلامی ریاست کا کامل وفادار بن کر رہنا ہو گا..... مزید یہ کہ اسلامی ریاست میں وہ کسی ایسے منصب پر فائز نہیں ہو سکیں گے جو اولوالامر کی تعریف میں آتا ہو۔ وہ پالیسی بنانے والے ایوانوں کے رکن نہیں بن سکیں گے۔ ان کی حیثیت وہ ہو گی جو سورہ توبہ میں ان الفاظ میں آئی ہے' جس کا شاید پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ۔

"یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ" "وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں" ..... خلاصہ کلام یہ کہ ہمارے مفسرین و فقہائے مجتہدین رحم اللہ عنہم اجمعین نے "فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ" کی تفسیر کے ذیل میں احسان کی یہ چار شکلیں بیان کی ہیں۔ ان کو ترتیب وار اپنے ذہن میں بٹھا لیجئے..... پہلی تو یہ ہے کہ قتال فی

سبیل اللہ کے نتیجے میں گرفتار ہونے والے مشرکین کی جان بخشی کر دی جائے..... اس سے بڑا احسان اور کیا ہو گا..... ورنہ قتل کے مستحق و مستوجب تھے۔ وہ اللہ کے دین کے مقابلہ پر آئے' اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں..... دوسری یہ کہ ان کو قید میں رکھو "فَشُدُّوا الْوَثَاقَ" ان کو خوب مضبوطی سے باندھ کر رکھو۔ غزوہ بدر کے بعد جتنی دیر تک فدیہ کا معاملہ نہیں ہوا' مشرکین کو قید میں رکھا گیا۔ لیکن ان کا پورا پورا خیال رکھا گیا' انہیں کوئی ایذا اور تکلیف نہیں پہنچائی گئی..... تیسری شکل یہ ہے کہ انہیں غلام کی حیثیت دے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور انہیں اسلامی معاشرہ میں جذب کر دیا جائے..... چوتھی یہ کہ انہیں بطور غلام مسلمان معاشرے میں تقسیم تو نہیں کیا جائے گا لیکن وہ بحیثیت مجموعی اسلامی ریاست میں معاہد یا ذمی کی حیثیت سے نسبتاً کمتر درجے کے شہری (SECOND RATE CITIZEN) کے طور پر رہ سکیں گے۔

فدیہ کی مختلف شکلیں

غیر مسلم قیدیوں کی رہائی کی دوسری صورت یہاں "وَاِمَّا فِدَاءً" کے الفاظ میں بیان ہوئی ہیں۔ یعنی مسلمانوں کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔ فدیہ کی بھی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان سب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا ہے..... ایک شکل فدیہ کی یہ ہے کہ کوئی رقم معین کر دی گئی کہ قیدی کے اعزہ یا ہم مسلک لوگ وہ رقم ادا کریں تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ رقم ہر شخص کے لئے اس کی حیثیت کے مطابق مقرر کی جاتی تھی۔ اندازہ یہ ہے کہ اس مد میں آج کل کے پاکستانی روپے کے حساب سے ایک ہزار سے چار ہزار کے مساوی رقم کا تعین کیا گیا تھا۔

اس گفتگو کے نتیجہ میں اس وقت دو واقعات یاد آ گئے وہ عرض کئے دیتا ہوں..... حضورؐ کی سب سے بڑی دختر حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شوہر ابو العاصؓ بھی غزوہ بدر کے قیدیوں میں شامل تھے' اور حضورؐ کے چچا حضرت عباس بھی قیدیوں میں تھے' یہ دونوں حضرات اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے..... چونکہ "فَشُدُّوا الْوَثَاقَ" کا حکم آ چکا تھا

لہٰذا تمام قیدیوں کو خوب جکڑ کر باندھا گیا تھا جس کے باعث رات کو حضرت عباسؓ کراہ رہے تھے۔ حضورؐ تک ان کے کراہنے کی آواز پہنچ گئی۔ آپؐ نے حکم دیا کہ تمام قیدیوں کے بند ڈھیلے کر دیئے جائیں۔ صرف چچا کے لئے حکم نہیں دیا بلکہ ان کے طفیل تمام قیدیوں کے بند ڈھیلے کرنے کا حکم دیا..... دوسرا واقعہ تو ایسا ہے کہ جب بھی وہ واقعہ سامنے آتا ہے تو کم سے کم میرے لئے آنسو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو العاصؓ کی رہائی کے لئے فدیہ کے طور پر مکہ سے دخترِ رسولؐ حضرت زینبؓ نے اپنا ہار بھیجا تھا۔ وہ اس وقت تک مکہ ہی میں مقیم تھیں۔ حضورؐ نے جب وہ ہار دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یاد آ گئیں۔ وہ ہار حضرت خدیجہؓ کا تھا۔ انہوں نے بطور ہدیہ اپنا ہار بیٹی کو دیا تھا..... حضرت خدیجہؓ کی رفاقت میں جو وقت گذرا تھا وہ حضورؐ کی ازدواجی زندگی کا خوشگوار ترین دور تھا..... اللہ تعالیٰ نے اولاد بھی حضرت خدیجہؓ ہی کے بطن سے دی تھی۔ حضورؐ کو انؓ سے بڑی محبت تھی اور انؓ کا ذکر اکثر آپؐ کی زبان مبارک پر آ جاتا تھا..... ہار دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر تم لوگ اجازت دو تو مرحومہ ماں کی جو یادگار بیٹی نے اپنے شوہر کے فدیہ میں بھیجی ہے، اسے لوٹا دوں۔ صحابہ کرامؓ کو کیا تامل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو العاصؓ کو رہا بھی کر دیا گیا اور ہار بھی واپس کر دیا گیا..... تو ایسے جذباتی واقعات بھی سیرت میں رونما ہوئے ہیں..... دوسری شکل حضورؐ نے یہ اختیار کی کہ قیدیوں میں جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، حضورؐ نے ان کو پیشکش کی کہ تم میں سے ہر ایک دس دس انصاری بچوں کو ابتدائی لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ اس کے عوض تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ فدیئے کی تیسری ممکن صورت یہ ہے کہ اگر دشمن کی تحویل میں مسلمان قیدی ہیں تو ان سے تبادلہ کر لیا جائے۔

حاصلِ گفتگو

ساری گفتگو کے نتیجہ میں یہ بات سامنے آئی کہ "مَنّ" یعنی احسان کی چار اور فدیہ کی تین شکلیں ہیں۔ اور یہ تمام شکلیں "فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" کے الفاظ میں مضمر ہیں۔ اب اگر کوئی شخص محض لغت کی مدد سے ان الفاظ کے معانی سمجھ کر اپنا قول لگاتا ہے

تو واقعہ یہ ہے کہ وہ صریح گمراہی میں ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ کے اصل مفہوم اور ان کے مضمرات و مقدرات کو سمجھتے ہیں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضورؐ سے زیادہ ان کو سمجھنے والا اور کون ہو سکتا ہے.....! یہاں "فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن میں تو اسیران جنگ کے لئے صرف دو شکلیں بیان ہوئی ہیں۔ اسیر اور غلام بنانے کا پورے قرآن میں سرے سے کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ یہ رائے اور یہ نتیجہ سراسر گمراہی ہے۔ یہ رائے سنت رسول، تعامل صحابہؓ اور اجماع امت پر خط تنسیخ پھیرنے کی جسارت ہے..... میں عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے تمام علمائے حق نے اسی آیت سے غلامی کا جواز بھی مستنبط کیا ہے۔ پھر اس کے جواب کے لئے ہمارے پاس سنت رسولؐ، تعامل صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعین نیز ائمہ مجتہدینؒ کا اجماع ہے۔ اور ان سب کے ہوتے ہوئے کوئی اور رائے رکھنا بہت بڑی جسارت ہے۔ یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس موضوع پر نہایت مدلل اور جامع بحث آپ کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی تفہیم القرآن میں سورہ محمدؐ کی تفسیر میں ملے گی[1] میں آپ حضرات کو مشورہ دوں گا کہ اس کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

میرے غور و فکر کا حاصل

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مجھے ان مسائل پر غور و تدبر کی جو سعادت نصیب ہوئی ہے اس کے نتیجہ میں میری جو رائے بنی ہے اب میں اسے پیش کر رہا ہوں۔ "حتی تضع الحرب اوزارھا" کی تشریح کے ذیل میں، میں عرض کر چکا ہوں کہ اس میں حرب سے مراد صرف ایک لڑائی _____ (BATTLE) نہیں ہے۔ بلکہ 'WAR' (جنگ) ہے یعنی وہ کشاکش اور جنگ مراد ہے جو قریش اور اہل ایمان کے مابین صلح حدیبیہ ۶ھ تک چلتی رہی تھی۔ لیکن خیال رہے کہ یہ صلح بھی جنگ کے مستقل

---

[1] مولانا مرحوم کی اس موضوع پر نہایت مفصل و مدلل بحث ان کے مجموعہ مضامین "تفہیمات" حصہ دوم میں بھی ملے گی (مرتب)

خاتمہ کے لئے نہیں تھی بلکہ ایک مدت معینہ اغلباً دس سال کے لئے ہوئی تھی۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ قریش کے معاملہ میں "حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا" کا اطلاق ہوتا ہے فتح مکہ کے بعد.....

آپ کو معلوم ہے کہ صلح حدیبیہ کے دو ہی سال بعد قریش کی جانب سے معاہدے کی خلاف ورزی کا ظہور ہوا تھا جس کے نتیجہ میں معاہدے کے ٹوٹنے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ بنو بکر نے جو قریش کا حلیف قبیلہ تھا' بنو خزاعہ پر جو مسلمانوں کا حلیف قبیلہ تھا' صلح حدیبیہ کے دو سال بعد اچانک حملہ کیا اور قتل و غارت گری کی۔ اس حملے میں قریش نے بھی صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دریردہ بنو بکر کا ساتھ دیا..... بنو خزاعہ کے لوگ جب حضورؐ کے پاس فریاد لے کر پہنچے تو آپؐ نے اپنے ایک ایلچی کو مکہ بھیجا اور قریش کے سامنے تین متبادل شکلیں پیش کیں۔ ایک یہ کہ مقتولوں کا خون بہا ادا کیا جائے۔ دوسری یہ قریش بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں تاکہ مسلمان بنو خزاعہ کی دادرسی کرتے ہوئے بنو بکر سے ان کے ظلم کا بدلہ لے لیں..... تیسری یہ کہ اگر ان دو شرطوں میں سے کوئی بھی منظور نہ ہو تو قریش کی طرف سے اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا..... قریش کے چند جوشیلے لوگوں نے برملا کہہ دیا کہ "ہمیں صرف تیسری شکل منظور ہے"۔ بعد میں قریش پچھتائے کہ یہ فیصلہ قریش کے حق میں مضر ہو گا چنانچہ ان کی طرف سے ابو سفیان جو اس وقت پورے قریش کے سردار تھے مدینہ پہنچے' انہوں نے سرتوڑ کوشش کی کہ صلح کی تجدید ہو جائے۔ لیکن حضورؐ نے دانستہ صرف نظر فرمایا اور تجدید صلح کی حامی نہیں بھری بلکہ خاموشی اختیار کئے رکھی..... اس لئے کہ آپؐ کو خوب اندازہ تھا کہ اب قریش میں کوئی دم خم باقی نہیں رہا۔ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اول تو آنے کی جرأت ہی نہیں کریں گے اگر آئیں گے تو ہزیمت و شکست سے دوچار ہوں گے۔

احسان کا اصل موقع

صلح کے ٹوٹتے ہی حضورؐ نے فوری طور پر اقدام کا فیصلہ فرمایا۔ یہ بات تاریخی طور پر

ہمارے سامنے ہے کہ رمضان المبارک ۸ھ میں دس ہزار قدوسیوں کے لشکر کے ساتھ حضورؐ مکہ تشریف لائے اور کسی خون ریزی کے بغیر مکہ فتح ہو گیا۔ صرف ایک معمولی جھڑپ مسلمانوں کے اس دستہ کے ساتھ قریش کے چند نوجوانوں کی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے ہوئی، جس کے سپہ سالار حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ اس کے نتیجہ میں تین مسلمان شہید ہوئے اور تیرہ مشرکین قتل ہوئے...... بہرحال قریش کے ساتھ 'WAR' یعنی حرب کے مکمل خاتمے کا معاملہ فتح مکہ کے بعد ہوا...... گویا کہ 'اثخان' یعنی کفار کی قوت کو مکمل طور پر کچلنے کا معاملہ دراصل فتح مکہ کے بعد آنے والا تھا۔ لیکن چونکہ ایک تو قریش کی طرف سے مزاحمت ہی نہیں ہوئی۔ اور دوسری بات اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رءوف و رحیم اور رحمۃ للعٰلمین ہونے کی جو شانیں عطا فرمائی تھیں تو ان کا کامل ظہور فتح مکہ کے موقع پر ہوا...... غور کیجئے کہ جباران قریش مفتوحین کی حیثیت سے حضورؐ کے سامنے جمع ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے مکہ کی زمین پر اہل ایمان کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ جنہوں نے ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تھے۔ وہ بھی ہیں جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے، ... جنہوں نے حضورؐ کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جنہوں نے حضورؐ کو ہجرت کے بعد سے صلح حدیبیہ تک ایک دن بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ لیکن حضورؐ نے ان جباران قریش سے اتنا ہی فرمایا کہ "میں آج تم سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے کہا تھا کہ۔ "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ" "آج کے دن تم پر کوئی ملامت، نہیں ہے" .... اور فرمایا "اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ" "جاؤ تم سب آزاد ہو" ..... ورنہ حضورؐ ان میں سے جس کی چاہتے گردن مار سکتے تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحیمی، شان رافت اور شان عفو کے ظہور کا یہ موقع تھا.... یہ تھا صحیح محل فَاِمَّا مَنًّا کے اظہار کا۔ چونکہ قریش کی حد تک فتح مکہ کے بعد حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا" کی تکمیل ہو گئی تھی۔

غزوۂ حنین کے اسیروں کا معاملہ

قریش مکہ کی حد تک تو حرب ' WAR ' کا اختتام فتح مکہ کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ لیکن مکہ کے گرد و نواح میں ہوازن اور ثقیف کے جو طاقت ور قبیلے آباد تھے' انہوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں پر یک بارگی حملہ کر دیا جائے' لہٰذا وہ بڑی تیاریوں کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کے لئے نکلے۔ حضورؐ کو برابر اطلاعات مل رہی تھیں۔ حضورؐ بارہ ہزار کا لشکر لے کر مقابلہ کے لئے نکلے۔ حنین اور اوطاس کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ اس موقع پر ابتداءً مسلمانوں کے پیر اکھڑ گئے لیکن جلد ہی اللہ تعالیٰ کی نصرت سے مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ بے شمار مال و اسباب غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ مزید برآں چھ ہزار کے لگ بھگ افراد جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے اسیر ہوئے..... حضورؐ نے قیدیوں اور مال غنیمت کو جعرانہ کے مقام پر چھوڑا اور طائف کے محاصرہ کے لئے تشریف لے گئے۔ محاصرہ نے طول پکڑا تو آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اور یہ دعا فرما کر محاصرہ اٹھا دیا کہ "اے اللہ! تو ثقیف کو ہدایت دے اور انہیں میرے پاس بھیج دے۔" حضورؐ کی دعا قبول ہوئی اور کچھ عرصہ کے بعد پورے قبیلہ نے صدق دل سے اسلام قبول کر لیا.....

طائف سے محاصرہ اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت اور اسیران حنین کی تقسیم کے لئے جعرانہ واپس تشریف لائے اور آپؐ نے پہلے تو مال و اسباب غنیمت تقسیم فرمایا۔ اسیران کی تقسیم کا کام ابھی باقی تھا کہ ہوازن اور ثقیف کی ایک سفارت نے نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان اسیران جنگ میں جو عورتیں ہیں ان ہی میں تمہاری پھوپھیاں اور خالائیں بھی ہیں تم نے ہمارے قبیلہ کا دودھ پیا ہے۔ (اشارہ تھا حضرت حلیمہ سعدیہ کی طرف جو بنو ہوازن سے تھیں) لہٰذا ہمارے قبیلہ والے تمہارے رشتہ دار ہیں۔ کیا تم ان کو غلام اور لونڈیاں بنا کر اپنے لشکر میں تقسیم کر دو گے! خدا کی قسم! اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ان سے بھی ہم کچھ امید رکھتے لیکن تم سے تو ہماری کہیں زیادہ توقعات ہیں"..... نبی اکرمؐ نے

اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا۔ "میرے اپنے خاندان یعنی خاندان عبد المطلب کا جو بھی حصہ ہو گا' وہ میری طرف سے آزاد ہے۔ لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد مجمع میں اپنی یہ درخواست پیش کرو۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضور نے وہاں بھی یہی جواب دیا کہ "مجھے صرف اپنے خاندان کے حصہ کا اختیار ہے' وہ آزاد ہے" اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ "میں تمام مسلمانوں سے بھی ان اسیران جنگ کی رہائی کی سفارش کرتا ہوں"..... مہاجرین و انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین بیک زبان پکار اٹھے کہ "ہمارا حصہ بھی حاضر ہے"..... چنانچہ اس طرح وہ چھ ہزار اسیران جنگ جو بحیثیت غلام و لونڈی مجاہدین میں تقسیم ہونے والے تھے دفعۃً سب کے سب آزاد ہو گئے۔ بعد ازاں جلد ہی ہوازن کا قبیلہ بھی صدق دل سے ایمان لے آیا۔ ثقیف کے قبیلہ کے ایمان لانے کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

ایک اہم سوال!

میں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اسیران غزوہ حنین کی رہائی کا یہ واقعہ صحیح ترین اسناد کے ساتھ متعدد مستند کتب احادیث میں موجود ہے۔ اسی طرح اس کا ذکر سیرت النبیؐ کی جملہ قدیم مستند کتابوں میں ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ منکرین سنت و حدیث اپنے باطل موقف کی مدافعت میں سیرت کے کس کس واقعے کو جھٹلائیں گے! یہ واقعہ ۸ھ میں ظہور پذیر ہوا۔ جبکہ سورہ محمدؐ کا زمانہ نزول جمہور علماء کے نزدیک غزوہ بدر سے پہلے ہے یعنی ۲ھ کے قریباً اوائل میں..... اگر ان منکرین سنت کا موقف صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام میں غلامی کا ادارہ (INSTITUTION OF SLAVERY) سرے سے موجود ہی نہیں اور اسیران جنگ کے لئے قرآن کی ہدایات صرف یہ ہیں کہ "فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" ان کو بطور احسان چھوڑ دو یا فدیہ لے کر آزاد کر دو"..... تو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ خاکم بدھن کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین میں جو اسیر بنائے تھے اور ان کو مجاہدین میں بطور لونڈی غلام تقسیم کرنے کا ارادہ فرمایا۔ تو حضورؐ قرآن مجید کی ہدایت اس کے مدعا اور اس کے منشاء کے خلاف عمل کرنے والے تھے!

العیاذ باللّٰہ! جب انسان شعوری طور پر زیغ وضلالت کی راہ پر چل پڑتا ہے تو اس کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے اور اس سے ایسی ہی حماقتیں ظاہر ہوتی ہیں جیسی ان منکرین حدیث سے ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ لوگ نہ جانے محض اپنی انشاپردازی کے زور پر کتنی مخلوق کو گمراہ کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے فتنوں سے محفوظ ومامون رکھے [1]

جزیرہ نمائے عرب میں جنگ کا خاتمہ

اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ غزوہ بدر کی شکل میں جس سلسلۂ قتال وحرب کا آغاز ہوا تھا' قریش مکہ کی حد تک اس کا اختتام فتح مکہ پر ہو گیا اور پھر غزوۂ حنین کے بعد بنو ہوازن اور بنو ثقیف کے قبول اسلام کے نتیجے میں اندرون ملک عرب یہ سلسلۂ قتال اپنے اختتام کو پہنچ گیا اور پورے جزیرہ نمائے عرب پر اسلام دین کی حیثیت سے غالب ہو گیا گویا جزیرہ نمائے عرب کی حد تک "حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا" کا معاملہ پورا ہو گیا۔

لیکن اور یہ "لیکن" بہت اہم ہے..... خاتم النّبیین' سید المرسلین جناب محمد صلی اللہ

---

[1] سیرت النبیؐ کی تمام مستند کتب اور صحیح کتب احادیث میں غزوہ بنو المصطلق کا واقعہ مذکور ہے۔ اس غزوہ میں چھ سو اسیران جنگ کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس قبیلہ کی ایک خاتون جویریہ حضرت ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آئی تھیں۔ حضورؐ نے رقم ادا کر کے انہیں خرید لیا اور پھر آزاد کر دیا۔ پھر آپؐ نے ان کو نکاح کا پیغام بھیجا جو انہوں نے قبول کر لیا اور مسلمان ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالہ عقد میں آئیں اور ام المومنین قرار پائیں۔ جب اس غزوہ میں شریک مجاہدین کو اس نکاح کا حال معلوم ہوا تو سب نے اپنے اپنے حصہ کے لونڈی غلام فوراً آزاد کر دیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار قبیلہ کے افراد کیسے غلام رہ سکتے ہیں! یہ غزوہ شعبان ۵ھ میں واقع ہوا تھا۔ یعنی سورہ محمدؐ کے نزول کے قریباً تین سال بعد۔ کاش! ان منکرین سنت کو اللہ صحیح راہ کی ہدایت و توفیق عطا فرمائے..... ان کا سارا یہ استدلال کہ اسلام میں اسیری اور غلامی کا کوئی تصور ہی موجود نہیں ہے' ان واقعات کی روشنی میں ریت کی دیوار سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا (ج ر)

علیہ وسلم کی بعثت صرف اہل عرب کے لئے نہیں تھی۔ کسی خاص زمان و مکان کے لئے نہیں تھی۔ آپ کا دور رسالت تو قیامت تک جاری ہے۔ "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا" "اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام نوع انسانی کے لئے بشیر نذیر بنا کر" ابھی تک تو جزیرہ نمائے عرب تک انقلاب محمدی علی صاحب الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل ہوئی ہے ابھی تو بقیہ پوری دنیا تک دعوتِ توحید کو پہنچانا اور دین الحق کو غالب کرنا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

بیرونِ عرب سلسلۂ قتال وحرب کا آغاز

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد پہلے خلیفہ راشد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے تو ان تمام مزاحم قوتوں کا سر کچلا جو اندرون عرب انقلاب محمدی کی تکمیل کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی تھیں۔ ان پر قابو پانے کے بعد حضرت ابو بکر نے بیرون ملک عرب انقلاب محمدی کی توسیع کی طرف توجہ دی اور قتال فی سبیل اللہ کا دائرہ فارس اور روم کی سلطنتوں تک بڑھا دیا۔ اور کل بیس سال یعنی حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے ابتدائی آٹھ سالوں تک ایک طرف ایران، عراق، شام فلسطین اور مصر سے لے کر مراکش تک اللہ کا دین غالب ہو گیا اور دوسری طرف ماوراء النہر کے علاقے میں یعنی بخارا، تاشقند، سمرقند حتیٰ کہ کاشغر تک اللہ کے دین کا جھنڈا بلند ہو گیا۔ وہ تو یہودی سازشوں اور مجوسی ریشہ دوانیوں نے غلط فہمیاں پیدا کر کے داخلی اور اندرونی طور پر مسلمانوں کی قوت کو تقسیم کر دیا خانہ جنگی شروع کرا دی ورنہ کیفیت بقول علامہ اقبال یہ تھی کہ ع

تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا۔

رسالتِ محمّدی کا دَور جاری ہے

جب قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پوری نوع انسانی کے لئے رسول بنا کر مبعوث فرمائے گئے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ حضورؐ ہی کا دور رسالت جاری و ساری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ کیا پوری دنیا میں دین اسی طرح غالب ہو چکا ہے جیسے دور خلافت راشدہ میں دنیا کے ایک خاصے قابل ذکر حصے پر غالب و نافذ ہو گیا تھا اور کیا دنیا میں کفر کی طاقت کچلی جا چکی ہے! کیا باطل سرنگوں ہو چکا ہے؟ کوئی ہوش مند مسلمان اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔ ابھی تو یہ جنگ جاری ہے۔

غلامی کا ادارہ کیوں ختم نہیں ہوا! اب اس کی حکمت بھی جان لیجئے!..... یہ بات متبعین غلام احمد پرویز کی سمجھ میں شاید نہ آ سکے..... لیکن اہل دانش کے غور و فکر کے لئے اسے بیان کر رہا ہوں..... جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت بکمال و تمام اس وقت پورا ہو گا جب پورے کرہ ارض پر اللہ کے دین کا جھنڈا بلند ہو جائے گا۔ اور حضورؐ اس کی بشارت دے کر اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قیامت سے پہلے وہ وقت آ کر رہے گا کہ پوری دنیا پر اللہ کا دین غالب ہو گا اور تمام باطل ادیان مغلوب ہو کر رہیں گے۔ لیکن جب تک یہ صورت نہیں ہوتی امت محمدیؐ بالقوہ حالت جنگ میں ہے

ابھی یہ جنگ جاری ہے ختم کہاں ہوئی! یہ دوسری بات ہے کہ امت کی عظیم اکثریت اس ذمہ داری سے غافل ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ اسے بحیثیت امت کس کام کے لئے برپا کیا گیا تھا! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے کاندھوں پر کس ذمہ داری کا بوجھ رکھا تھا! لیکن افسوس یہی ہے کہ ع

"کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا۔"

مجھے بے انتہا روحانی حظ یاد آ گئے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے غزوۂ احزاب کے بعد اس وقت فرمائے تھے جب آپؐ ہتھیار کھول رہے تھے کہ حضورؐ! آپ نے ہتھیار کھول دیئے

ہم نے تو ابھی ہتھیار باندھے ہوئے ہیں اس لئے کہ آپؐ کو اسی وقت یہودی قبیلہ بنو قریظہ کی غداری کی سزا دینے کے لئے اقدام فرمانا ہے اور ہمیں اہلِ ایمان کی مدد کرنی ہے۔ اس پر آپؐ نے اہلِ ایمان کے لشکر کو حکم دیا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولے جائیں اور پھر آپؐ نے بنو قریظہ کی گڑھیوں کی طرف کوچ فرمایا۔

بہرحال جس طرح حضرتِ جبرئیلؑ نے ہتھیار نہیں کھولے تھے اسی طرح کوئی مسلمان جو واقعتہً امّتی ہے جنابِ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا وہ کیسے ہتھیار کھول سکتا ہے جب تک کہ پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین غالب نہ ہو جائے!! ہر امّتی کفر کے خلاف محاذِ جنگ پر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حقیقی ایمان و یقین کی دولت ہمارے پاس نہ رہی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم خود دنیا کے پجاری بن گئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم خود باطل سے مغلوب و مرعوب ہیں۔ ہمارے اندر جذبہ نہیں ہے، ہمّت نہیں ہے، حوصلہ نہیں ہے۔ ہمیں دین کے فرائض کا شعور ہی حاصل نہیں ہے۔ ہم صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ہی کو فرائضِ دینی سمجھ بیٹھے ہیں۔ ہمارے سامنے دین کا انقلابی اور حرکی تصوّر رہے ہی نہیں! اِلّا مَاشَاءَ اللّٰہ۔

اس پوری بحث کو ذہن میں رکھیں تو آپ بھی اسی نتیجے تک پہنچیں گے کہ۔

جب تک پورے کرہ ارض پر اللہ کا دین غالب نہیں ہو جاتا، اس وقت تک جنگ و قتال کا سلسلہ جاری رہے گا [۱] اور جب تک جنگ جاری ہے "فَشُدُّوا الْوَثَاقَ" کا قرآنی حکم برقرار رہے گا۔

یہ بات اس سے پہلے واضح کی جاچکی ہے کہ جب تک جنگ مکمل طور پر ختم نہیں ہو جاتی اور "حتّٰی تضع الحرب اوزارھا" کا معاملہ مکمل نہیں ہو جاتا قرآن کا حکم یہی ہے کہ قیدیوں کو مضبوطی سے باندھے رکھو۔ اور ظاہر بات ہے کہ مضبوطی سے باندھنے کی صورت تو یہی ہے کہ یا انہیں پس دیوار زنداں رکھا جائے اور یا پھر غلام کی حیثیت دے کر معاشرے میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہاں سلسلہ جنگ کے خاتمے پر انہیں بطور احسان بھی رہا کیا جا سکتا ہے اور فدیئے کے عوض بھی انہیں رہائی دی جا سکتی ہے.......... باقی صفحہ ۱۰۴ پر

---

[۱] سورہ انفال کی یہ آیت اس مضمون کے بیان میں انتہائی جامع ہے "وقاتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃ و یکون الدین للہ کلہ"

پروفیسر حافظ احمد یار

خدمتِ قرآن کے میدان

—— یہ مقالہ انجمن کے زیرِ اہتمام سالانہ محاضراتِ قرآنی منعقدہ مارچ ۷۰ء میں پڑھا گیا ——

قرآن کریم پر کلام اللہ اور کتاب اللہ کی حیثیت سے ایمان لانا ایک مسلمان کے لئے اجزائے ایمان کا ایک جزو بھی ہے اور کامل و مکمل ایمان کے مضمرات اور مقتضیات کی تمام تفصیلات کی اساس اور بنیاد بھی ہے۔ قرآن بیک وقت منبع ایمان اور سرچشمہ یقین بھی ہے اور سالک راہ خدا یا مجاہد فی سبیل اللہ کے لئے راہ و رسم منزل سے آگاہی اور سخت مقامات کی نشان دہی پر مشتمل ایک مکمل مجموعہ ہدایت بھی ہے —— قرآن معاش و معاد یعنی دنیا و آخرت کی فلاح و کامرانی کے لئے راہنما ہے اور اس نصب العین کے حصول میں پیش آنے والی ہر مشکل کا حل اور ہر مرض کی دواء اور شفاء ہے۔ گویا وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا۔

مگر اس وقت ہمارا موضوع قرآن کی اہمیت یا عظمت کا بیان نہیں ہے۔ یہ چند فقرے بھی تمہید کے طور پر زبان (قلم) پر آ گئے۔

دینِ اسلام میں قرآن کا یہ مقام ہی اس کے ماننے والوں پر کچھ فرائض اور واجبات عائد کرتا ہے۔ اسی کو آپ "مسلمانوں پر قرآن کے حقوق" بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان حقوق اور فرائض کو مختصراً ہم پانچ یا چھ بنیادی عنوانات میں تقسیم کر کے "حقوق پنجگانہ" یا شش جہات واجبات کی صورت میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ مگر ان حقوق کی ادائیگی اور ان فرائض کی بجا آوری سے خدمتِ قرآن کے اتنے میدان سامنے آتے ہیں کہ ان تمام میدانوں میں قرآن کے لئے کام کرنا اور اس میں خدمت کا حق ادا کرنا کسی ایک فرد کے لئے ممکن ہی نہیں۔ اسی لئے یہ مجموعی طور پر پوری امت کی ذمہ داری ہے اور تقسیم کار کے طور پر اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق قرآن کریم کی کوئی نہ کوئی خدمت سرانجام دینا ہر مسلمان پر فرض ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے صحابہ کرامؓ اور اُن کے تابعین اور بعد میں آنے والے سلف صالحین نے مختلف میدانوں میں قرآن کی جو خدمات سرانجام دیں اس نے آنے والوں کے لئے نہ صرف عمل کی راہیں متعین کر دیں بلکہ خدمتِ قرآن کے بہترین عملی نمونے بھی چھوڑے ہیں۔

ڈاکٹر لبیب السعید نے اپنی کتاب "الجمع الصوتی الاول للقرآن الکریم" میں امتِ مسلمہ کی قرآنی خدمات پر تبصرہ کا آغاز علامہ عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں سے چند سطروں کے ترجمہ سے کیا ہے۔

لیس فی الدنیا کتاب وضعت فی خدمتہ مثل ھذہ الکثرۃ من المواھب التی وضعت فی خدمۃ القرآن ولا مثل ھذہ الوفرۃ من العمل والوقت والمال "

علامہ عبداللہ یوسف علی مرحوم کی اصل عبارت یوں ہے:

"There is no Book in the world in whose service so much talent, so much labour, so much time and money have been expended as has been the case with the Quran."

قرآن سے متعلق فرائض ادا کرنے یا قرآن کے لئے خدمات سرانجام دینے کے کام کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) حفاظتِ قرآن (۲) نفاذِ قرآن

حفاظتِ قرآن میں اس کے متن کی حفاظت، اس کے معنی کی حفاظت اور اس کی حقانیت کی حفاظت شامل ہیں اور حفاظتِ قرآن کی غایت احکام قرآنی کا عملی نفاذ ہے۔ حفاظتِ قرآن سے متعلق تمام خدمات و انتظامات آیۂ کریمہ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ" کی عملی تفسیر اور ظہورِ حق کا ایک نمونہ ہیں تو نفاذِ تشریع قرآنی کی ہر مخلصانہ کوشش لفجوائے آیتِ کریمہ "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ"، غلبۂ حق کی منزلِ مراد کی طرف ایک قدم ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اگر کسی زمانے میں یا کسی ایک جگہ کے مسلمانوں نے خدمتِ قرآن کے کسی ایک میدان میں کوتاہی اور تساہل سے کام لیا تو اس کی تلافی کے لئے کسی دوسرے زمانے یا کسی دوسرے علاقے میں اللہ تعالےٰ افراد وجماعات کی صورت میں خدامِ قرآن پیدا کرتا رہا ہے۔

حضرات! یہاں تک پہنچنے کے بعد اور "منزلِ مراد" اور "ادائے واجب" میں کوتاہی" کے ذکر سے مجھے پاکستان اور قرآن میں ایک عجیب مماثلت نظر آئی۔ مثلاً

(۱) دونوں کی خدمت خلوص سے زیادہ چرب زبانی کے ساتھ کی جارہی ہے۔

(۲) دونوں کے واسطے کام کرنے والوں کے مقابلے پر دونوں سے اپنا کام لینے والے زیادہ ہیں۔

(۳) پاکستان کے مقاصد اور قرآن کے مطالب کا خلاصہ لا الہ الا اللہ ہی تھا اور ہے لیکن دونوں کے نام لیواؤں میں اللہ اور غیر اللہ کے فرق کو بھی نہ سمجھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

(۴) پاکستان اور قرآن کے مقاصد کے مطابق چلنے کی بجائے دونوں کو اپنے مقاصد کے مطابق "چلانے" والے بھی سرگرم عمل ہیں۔

(۵) اس وقت دونوں ہی اندرونی خرکاروں اور بیرونی تخریب کاروں کے نرغے میں ہیں۔

اور یوں دونوں کی خدمت میں ایک طرح کا عدمِ استحکام پیدا ہوگیا ہے۔

یہ سوچ کر اور پھر یہ دیکھ کر کہ ان محاضرات کے عنوانات میں استحکام کا لفظ غالب ہے۔ تو اب مجھے اپنے عنوان "خدمتِ قرآن کے میدان" کو "استحکامِ خدماتِ قرآن" میں بدل لینا مناسب معلوم ہوا۔

نیز اس وجہ سے بھی کہ خدمتِ قرآن کے میدان اب میں کیا متعین کروں گا۔ وہ تو عہدِ رسالت اور دورِ تبع تابعین کے درمیان ہی متعین ہوچکے تھے۔ بعد والے تو اس میں اپنی خدمت کے لئے "ختم شریف" کا اضافہ ہی کرسکے۔

لہٰذا اب ہم خدمتِ قرآن کے صرف ان پہلوؤں پر نظر ڈالیں گے جہاں ہمارے بزرگوں

نے تن دہی سے کام کیا مگر ہم نے اپنی غفلت سے عدم استحکام کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس طرح خدمتِ قرآن کے بنیادی میدان بنتے ہیں: اسے لکھنا لکھانا۔ اسے پڑھنا پڑھانا۔ اسے سمجھنا سمجھانا۔ اس کو دشمنوں کے حملوں سے بچانا اور معاشرے میں اسی کے قانون کا سکہ جمانا۔

● قرآن کے لیے کوئی خدمت سرانجام دینے کا سب سے پہلا موقع یا اعزاز جو بعض صحابہؓ کو حاصل ہوا وہ کتابتِ وحی کا تھا۔ عہدِ رسالت میں کتابتِ آیات کی یہ خدمت ہی عہدِ صدیقی میں جمعِ قرآن بصورتِ مصحف ظاہر ہوئی اور اسی مصحف کی نقول سے عثمانی ایڈیشن کے مصاحف تیار کئے گئے۔ اس طرح مصاحفِ عثمانیہ کے ذریعے عہدِ نبویؐ کا طریقِ کتابت بھی محفوظ ہو گیا — اور اسی لیے آئندہ کے لئے کتابتِ مصحف کا معیارِ صحت یہی قرار پایا کہ وہ ان مصاحف میں سے کسی ایک کی ہو بہو نقل ہو۔ یا اس سے تیار کردہ نقل کی نقل ہو — اور اس میں مصاحفِ عثمانی میں استعمال شدہ طریقِ املاء و ہجا سے سرِمو بھی تفاوت نہ ہو۔ اس طریقِ املاء کا نام ہی رسمِ عثمانی پڑ گیا۔ اور جن کو بوجوہ یہ نام اچھا نہ لگا انہوں نے بھی رسمِ قرآنی یا رسمِ مصحف کے نام سے اسی طریقِ املاء و ہجاء کی پیروی کو لازمی مانا۔

یہی وجہ ہے کہ کاتبانِ مصاحف کی راہنمائی کے لیے اور علمائے تجوید و قرأت کے استفادہ کے لئے اس مخصوص فن یعنی علم الرسم پر الگ کتابیں تالیف کی گئیں۔

مختلف عوامل کے باعث بعض اسلامی خصوصاً ایشیائی ممالک میں رسمِ عثمانی کے اس التزام سے تساہل برتا جانے لگا۔ تاہم اندلس اور افریقی ممالک اس خرابی سے محفوظ رہے۔

رسمِ عثمانی کی غلطیوں پر مبنی نسخوں سے کتابت کے باعث آہستہ آہستہ یہ غلط املاء آنکھوں کو مانوس نظر آنے لگا۔ مصاحفِ خطیہ کے دور تک تو قدرتاً ان اغلاط کی اشاعت کا دائرہ محدود رہا مگر دورِ طباعت میں یہ اغلاط آناً فاناً اضعافاً مضاعفہ ہونے لگیں تو اہلِ علم اس صورتِ حال سے بے چین ہو گئے اور گزشتہ صدی میں اس کوتاہی اور تساہل کے خلاف آواز اٹھنے لگی۔ ۱۸۹۱ء/۱۳۰۸ھ میں رضوان بن محمد المخللاتی کے زیرِ اہتمام مصر سے ایک مصحف شائع ہوا جس میں بڑی حد تک رسمِ عثمانی کا التزام کیا گیا تھا۔ اس کے بعد قاہرہ ہی سے حکومتِ مصر کے زیرِ اہتمام فواد الاوّل کے زمانے میں ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء میں اہلِ علم ماہرینِ فن کے ایک بورڈ کی نگرانی میں بڑے اہتمام سے

وہ مشہور نسخہ شائع ہوا جو عموماً مصحف الملک یا نسخہ امیریہ کے نام سے معروف ہے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۷۱/۱۹۵۴ میں شائع ہوا اور اس میں رسم عثمانی کی ان چار غلطیوں کو بھی درست کر دیا گیا جو طبع اوّل میں رہ گئی تھیں۔ اس کے بعد سے شرق اوسط کے تمام عرب ممالک میں شائع ہونے والے مصاحف بالعموم اسی مصری مصحف طبع دوم سے نقل کئے جاتے رہے ہیں۔ اس مصری نسخے پر مبنی مگر بہت خوبصورت نسخہ دمشق سے الدار الشامیہ نے ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء میں شائع کیا اور ۱۹۸۵ء میں حکومت سعودی عرب نے یہی نسخہ مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف کے زیر اہتمام شائع کیا ہے۔ پاکستان میں مولوی ظفر اقبال صاحب مرحوم نے اسی مصری نسخہ پر مبنی تجویدی قرآن کا نسخہ تیار کروایا جسے پیکیجز لمیٹڈ نے ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں شائع کیا ہے۔ پاکستان میں شائع ہونے والا یہ واحد مصحف ہے جس میں رسم عثمانی کا التزام کیا گیا ہے۔

جن نسخوں کا ابھی ذکر ہوا ہے یہ سب قرأت کے لحاظ سے حفص عن عاصم والی روایت پر مبنی ہیں۔ مصری نسخہ کا اہتمام دیکھ کر بعض دوسرے افریقی ملکوں میں جہاں حفص کے علاوہ دوسری روایاتِ قرأت متداول ہیں۔ انہوں نے بھی رسم عثمانی کے التزام پر مبنی مگر اپنے ہاں رائج قرأت کی علاماتِ ضبط کے ساتھ مصاحف شائع کئے ہیں۔ ورش عن نافع والی روایت تمام افریقی ملکوں خصوصاً نائیجیریا مراکش وغیرہ میں عام ہے۔ حکومت سوڈان نے ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء میں دوری عن ابی عمرو البصری کی روایت پر مبنی نسخہ قرآن شائع کیا اور تونس سے ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء میں قالون عن نافع کی روایت پر مبنی نسخہ عبدالعزیز خماسی کی کتابت سے شائع ہوا اور ابھی حال میں حکومت لیبیا نے بھی قالون عن نافع کی روایت پر مبنی ابوبکر ساسی کی کتابت کے ساتھ ایک نسخہ قرآن شائع کیا ہے۔ یہ نسخہ بھی رسم عثمانی پر ہی مبنی ہے۔ ان مصاحف کی اشاعت سے ایک دفعہ پھر کتابت مصاحف میں رسم عثمانی کے التزام کا احساس یا تجدید احساس ایک تحریک کی شکل اختیار کر رہا ہے۔

رسم عثمانی کے عام رسم املائی سے اختلاف اور کتابت مصحف میں خود رسم عثمانی میں بھی کئی جگہ کسی اصول کی پابندی کے فقدان کے اسباب کی تلاش میں ـــــ رسم قرآنی کے توقیفی ہونے سے لے کر صحابہؓ کے قواعد املاء سے ناواقفیت جیسے انتہائی متضاد نظریات وجود میں آئے۔

ـــ تاہم گذشتہ صدی میں شمالی عرب اور شام کے بعض علاقوں سے قبل از اسلام دور کے بعض نبطی کتبات کی دریافت نے رسم عثمانی کے مآخذ و مصادر کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔

رسم قرآن کے اس فنی پہلو کے ساتھ ساتھ خط قرآن نے حسن و جمال کے کئی قالب گذشتہ چودہ صدیوں میں اختیار کئے اور جمالِ خط کے ساتھ بعض دفعہ کتابت مصاحف میں صنائع و بدائع کا استعمال تو بعض دفعہ اعجازِ قرآنی کا ایک مظہر نظر آتا ہے ـــ کتابت مصاحف یا خطِ قرآن جہاں خدمت قرآن کا ایک میدان ہے وہاں اس خدمت میں محبت و عقیدت کا ایک مظہر بھی ہے ۔

افسوس اور تعجب کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں طباعت و اشاعتِ قرآن کے نام سے لاکھوں بلکہ کروڑوں کا کاروبار کرنے والے ادارے ابھی تک رسم عثمانی کے مفہوم و معنی سے ناواقف ہیں اور ہماری حکومت جو آئینی اور قانونی طور پر قرآن کریم کی درست کتابت و طباعت کی ذمہ دار ہے ۔ وہ ابھی اس طرف کوئی عملی توجہ نہیں دے رہی ـــــ حکومت ناشروں کے نام ایک سرکلر جاری کر دیتی ہے کہ نسخہ ہائے قرآن رسم عثمانی کے مطابق شائع کئے جائیں لیکن خود حکومت اس معاملے میں کوئی راہنمائی کرنے سے قاصر ہے ۔

قرآن کریم کی کتابت ہی کے سلسلے میں ہجا و رسم کے علاوہ بعض اور امور مثلاً ضبط ، وقف، شمارِ آیات مواقع سجدات وغیرہ کی نشاندہی اور مختلف تقسیمات مصحف بھی شامل ہیں۔ تاہم ان امور کا تعلق چونکہ قرآن کریم کی قرأت سے ہے اس لئے ان کا ذکر ہم ابھی آگے تعلیم و تعلم قرآن کے ضمن میں کریں گے ۔

● کتابت کے بعد قرآن کی دوسری اہم بنیادی خدمت اس کا پڑھنا پڑھانا ہے ۔کتابت وحی کے برعکس قرأت، اور تلاوتِ قرآن کی ابتدا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی ـــ کتابت تو آپ کسی سے کروا لیتے تھے مگر قرآن کی قرأت آپ خود جبریل سے سن کر حفظ کر لینے کے بعد خود صحابہ کو پڑھاتے تھے ۔ آہستہ آہستہ آپؐ سے پڑھے ہوئے خود آگے پڑھانے پر

مامور کئے گئے۔ ابتدائی مکی دور سے ہی حضورؐ کی لکھوائی ہوئی سورتوں اور آیات کی نقول بھی صحابہؓ میں پھیلنے لگیں۔ اور قرآن حفظ بھی کیا جانے لگا۔ قرآن کریم کی قرأت کی تعلیم محض تحریر کی بجائے تلقی اور سماع کے ذریعے جاری رہی۔

مدنی دور کے آخری حصے میں قرآن کریم کی تعلیم اور تدریس قرأت علاقائی حکام بالا کی ذمہ داری قرار دی گئی۔ ہمارے لئے یہاں عہد نبوی میں قرآن پڑھنے پڑھانے کے اس نظام کی پوری تفصیلات میں جانا ممکن نہیں۔ البتہ یہاں قرأت قرآن کے سلسلے میں دو باتوں کا بیان کرنا ضروری ہے۔

(۱) ایک تو یہ کہ آپؐ نے اپنے عملی اقدامات کے علاوہ تعلیم و تعلم قرآن، اس کی قرأت اور اس کے حفظ کے فضائل پر اتنا زور دیا کہ اس سے مسلمانوں کے اندر تعلیم و تعلم قرآن کے لئے ایک جوش و خروش پیدا ہوگیا۔

(۲) قرأت قرآن کے سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ آنحضورؐ نے خود بھی قرآن کریم میں بعض کلمات کو ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھا اور پڑھایا ———— اور عرب کے مختلف قبائل کو ان کے اپنے لہجے میں قرآن پڑھنے کی اجازت دی ————

عربوں کے اس لہجاتی فرق کو سمجھنے کے لئے کتابوں میں متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ آنحضورؐ خود بھی ان قبائل کے ساتھ بعض دفعہ ان ہی کے لہجے میں گفتگو فرما لیتے تھے۔ صرف دو مثالوں سے اندازہ کر لیجئے :-

(۱) ایک آدمی نے آنحضرتؐ سے پوچھا : امم برّم صیامم بم سفر (یعنی أمن البر الصیام فی السفر)
آپؐ نے جواباً فرمایا : لیس مم برّم صیامم بم سفر (یعنی لیس من البر الصیام فی السفر)

۲) بنی سُلیم کے ایک آدمی نے پوچھا :
یارسول اللہ ایدالك الرجل اھلہ؟ (یہاں یدالك بمعنی یماطل آیا ہے)
آپؐ نے فرمایا : اذا کان مفلجا (یعنی مفلس)
ابوبکرؓ کے دریافت کرنے پر آپؐ نے اس کی وضاحت فرمائی تھی۔
قبائل عرب کی بعض لہجاتی خصوصیات کا ذکر کتابوں میں مختلف ناموں سے ملتا ہے۔

___ تاہم گذشتہ صدی میں شمالی عرب اور شام کے بعض علاقوں سے قبل از اسلام دور کے بعض نبطی کتبات کی دریافت نے رسم عثمانی کے مآخذ و مصادر کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔

رسم قرآن کے اس فنی پہلو کے ساتھ ساتھ خط قرآن نے حسن و جمال کے کئی قالب گذشتہ چودہ صدیوں میں اختیار کئے اور جمال خط کے ساتھ بعض دفعہ کتابت مصاحف میں صنائع و بدائع کا استعمال تو بعض دفعہ اعجاز قرآنی کا ایک مظہر نظر آتا ہے ___ کتابت مصاحف یا خطِ قرآن جہاں خدمت قرآن کا ایک میدان ہے وہاں اس خدمت میں محبت و عقیدت کا ایک مظہر بھی ہے ۔

افسوس اور تعجب کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں طباعت و اشاعتِ قرآن کے نام سے لاکھوں بلکہ کروڑوں کا کاروبار کرنے والے ادارے ابھی تک رسم عثمانی کے مفہوم و معنی سے ناواقف ہیں اور ہماری حکومت جو آئینی اور قانونی طور پر قرآن کریم کی درست کتابت و طباعت کی ذمہ دار ہے ۔ وہ ابھی اس طرف کوئی عملی توجہ نہیں دے رہی ___ حکومت ناشروں کے نام ایک سرکلر جاری کر دیتی ہے کہ نسخہ ہائے قرآن رسم عثمانی کے مطابق شائع کئے جائیں لیکن خود حکومت اس معاملے میں کوئی راہنمائی کرنے سے قاصر ہے ۔

قرآن کریم کی کتابت ہی کے سلسلے میں ہجا و رسم کے علاوہ بعض اور امور مثلاً ضبط ، وقف، شمارِ آیات مواقع سجدات وغیرہ کی نشاندہی اور مختلف تقسیمات مصحف بھی شامل ہیں۔ تاہم ان امور کا تعلق چونکہ قرآن کریم کی قرأت سے ہے اس لئے ان کا ذکر ہم ابھی آگے تعلیم و تعلم قرآن کے ضمن میں کریں گے ۔

● کتابت کے بعد قرآن کی دوسری اہم بنیادی خدمت اس کا پڑھنا پڑھانا ہے۔ کتابت وحی کے برعکس قرأت، اور تلاوتِ قرآن کی ابتداء خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی ___ کتابت تو آپ کسی سے کروا لیتے تھے مگر قرآن کی قرأت آپ خود جبریل سے سن کر حفظ کر لینے کے بعد خود صحابہ کو پڑھاتے تھے۔ آہستہ آہستہ آپ سے پڑھے ہوئے خود آگے پڑھانے پر

مامور کیئے گئے۔ ابتدائی مکی دور سے ہی حضورؐ کی لکھوائی ہوئی سورتوں اور آیات کی نقول بھی صحابہؓ میں پھیلنے لگیں۔ اور قرآن حفظ بھی کیا جانے لگا۔ قرآن کریم کی قرأت کی تعلیم محض تحریر کی بجائے تلقی اور سماع کے ذریعے جاری رہی۔

مدنی دور کے آخری حصے میں قرآن کریم کی تعلیم اور تدریس قرأت علاقائی حکام بالا کی ذمہ داری قرار دی گئی۔ ہمارے لیے یہاں عہدِ نبوی میں قرآن پڑھنے پڑھانے کے اس نظام کی پوری تفصیلات میں جانا ممکن نہیں۔ البتہ یہاں قرأت قرآن کے سلسلے میں دو باتوں کا بیان کرنا ضروری ہے۔

(۱) ایک تو یہ کہ آپؐ نے اپنے عملی اقدامات کے علاوہ تعلیم و تعلم قرآن، اس کی قرأت اور اس کے حفظ کے فضائل پر اتنا زور دیا کہ اس سے مسلمانوں کے اندر تعلیم و تعلمِ قرآن کے لئے ایک جوش و خروش پیدا ہوگیا۔

(۲) قرأتِ قرآن کے سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ آنحضورؐ نے خود بھی قرآن کریم میں بعض کلمات کو ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھا اور پڑھایا ــــــــ اور عرب کے مختلف قبائل کو ان کے اپنے اپنے لہجے میں قرآن پڑھنے کی اجازت دی ــــــــ

عربوں کے اس لہجاتی فرق کو سمجھنے کے لئے کتابوں میں متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ آنحضورؐ خود بھی ان قبائل کے ساتھ بعض دفعہ ان ہی کے لہجے میں گفتگو فرما لیتے تھے۔ صرف دو مثالوں سے اندازہ کر لیجئے :-

(۱) ایک آدمی نے آنحضرتؐ سے پوچھا : امم برّم صیامم یم سفر (یعنی أمن البر الصیام فی السفر)

آپؐ نے جواباً فرمایا : لیس مم برّم صیامم یم سفر (یعنی لیس من البر الصیام فی السفر)

(۲) بنی سُلَیم کے ایک آدمی نے پوچھا :

یا رسول اللہ ایدالك الرجل اھلہٗ؟ (یہاں یدالك بمعنی یماطل آیا ہے)

آپؐ نے فرمایا : اذا کان مفلجا (یعنی مفلسا)

ابوبکرؓ کے دریافت کرنے پر آپؐ نے اس کی وضاحت فرمائی تھی۔

قبائل عرب کی بعض لہجاتی خصوصیات کا ذکر کتابوں میں مختلف ناموں سے ملتا ہے۔

اس قسم کی چیزیں لغت قریش میں عیب شمار ہوتی تھیں اور قرآن لغت قریش میں ہی نازل ہوا تھا۔ بہرحال قبائل عرب کو اپنے لہجے کے ساتھ قرأت قرآن کی اسی اجازت سے ہی قرأت کا وہ اختلاف نمودار ہوا جس کے اندر افتراق امت کے ایک امکانی خطرہ کے سدباب کے لئے عہد عثمانی میں یہ اجازت واپس لے لی گئی اور مصحف صدیقی پر مبنی وہ عثمانی ایڈیشن تیار ہوا جو آج تک پوری امت کے لئے کتابت و قرأت قرآن کی صحت کا معیار چلا آتا ہے۔ اور جس میں کسی لفظ بلکہ دندانہ (نزہ) کے بدلے بغیر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق تواتر ثابت تمام اختلاف ہائے قرأت کی گنجائش موجود ہے۔

ابتدائی اموی دور میں غیر عربوں کو قرأت قرآن میں صحت و سرعت پر قادر کرنے کے لئے حرکات اور اعجام کی ابتدا ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ ایک مستقل علم بن گیا جسے علم الضبط کہا جاتا ہے۔ مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں اور تمام مستند اختلاف ہائے قرأت کو ملحوظ رکھنے کی بنا پر علم الضبط یا علامات ضبط کے اصول و قواعد مرتب ہوئے۔ قرأت قرآن سے مربوط علم الاصوات یا صوتیات قرآن (PHONETICS) کے تقاضوں کو علامات ضبط کے ذریعے واضح کرنے کی کوششیں جاری رہیں اور اب تک جاری ہیں۔ پرانے زمانے میں قلمی مصاحف میں بعض علامات ضبط سرخ سیاہی سے ڈالی جاتی تھیں۔ دور طباعت میں جب یہ ممکن نہ رہا۔ (اب ممکن ہے اگرچہ مہنگا ہے) تو علامات ضبط میں تجدید و ایجاد کا عمل ایک دفعہ پھر شروع ہوا۔ اس کے مظاہر مصر کے مصحف الملک کے علاوہ مصحف حلبی (۱۹۳۵/۱۳۵۴) نیز تونسی لیبی۔ سوڈانی سعودی مصحف اور پاکستان کے جدید قرآن مجید میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مختلف اسباب کی بنا پر دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں قراء سبعہ کی بعض خاص خاص روایات متداول ہو گئی ہیں۔ مثلاً مصر اور ایشیائی ممالک میں روایۃ حفص عن عاصم مراکش، غانا اور نائیجیریا میں ورش عن نافع۔ تونس و لیبیا میں قالون عن نافع۔ سوڈان میں الدوری عن ابی عمرو البصری رائج ہیں

اختلاف قراءات کے علاوہ بعض دفعہ ایک ہی روایت اور قرأت کے لئے مختلف ملکوں میں مختلف علامات ضبط استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً ترکی ایران برصغیر اور

چین میں روایتِ حفص رائج ہونے کے باوجود ہر ملک کی علاماتِ ضبط جدا ہیں۔ نائجیریا اور مراکش میں روایہ ورش کے باوجود اندازِ کتابت اور طریقِ ضبط دونوں جدا ہیں۔

دراصل ہر جگہ خادمانِ قرآن نے قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نطقِ صحیح کو مختلف علاماتِ ضبط کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے ملک میں اس کی جدید ترین اور مفید مثال تجویدی قرآن ہے۔

تمام علاماتِ ضبط کے اس سارے نظام اور ان تمام مساعی کے باوجود قرآن کی درست قرأت اور صحیح نطق کا دارومدار بالمشافہ تعلیم پر ہے۔ آپ کسی طریقۂ علاماتِ ضبط کو دیکھئے عموماً ہر مشکل تلفظ مثلاً ادغام ناقص۔ اخفاء۔ اظہار قلقلہ۔ امالہ۔ اشمام۔ اختلاس تسہیل ہمزہ یا بین بین اور اختلاس کی علامات لکھ کر بھی ساتھ ہی لکھا جاتا ہے کہ: یدرك بالمشافهه یا یوخذ بالتلقی والمشافهه اور کبھی صاف لکھا ہوتا ہے کہ: ولا یحکم ذلك کله الا بالمشافهة والسماع من لفظ الشیوخ"۔

دورِ حاضر کی ایجادات کو خدمتِ قرآن کے لئے استعمال کرتے ہوئے قرآن کے خادموں نے ریکارڈنگ کے ذریعے قراءات میں اس نطقِ صحیح کو بھی محفوظ کر لیا ہے جو بسند تواتر عہدِ نبوی سے علم القراءات کے اساتذہ فن کے ذریعے بذریعہ تلقی وسماع محفوظ چلا آتا تھا۔

اس وقت تک حفص، ورش اور دوری کی روایات قراءت میں مکمل قرآن ریکارڈ ہو چکا ہے۔ اور اب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تدریسی اور تعلیمی مقاصد کے لئے سبعہ قراءات پر مشتمل ریکارڈنگ جاری ہے۔

قرآن کی درست قراءت کی تعلیم کے سلسلے میں خدام قرآن کے نوٹس میں یہ بات لانا ضروری ہے کہ بچوں کو شروع سے ہی درست قراءت کے ساتھ قرآن پڑھانا فرض ہے۔ کم از کم بقدر نماز درست قرآن یاد کرنا اور اسے درست پڑھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

کہتے ہیں کہ مشہور تابعی ابوعبدالرحمٰن السلمی باوجود اپنی تمام تر علمی بزرگی اور بلندیٔ مرتبہ کے پورے چالیس سال تک جامع کوفہ میں صرف قرآن پڑھانے میں مصروف رہے اور یہ صرف حدیث "خیرکم من تعلم القرآن وعلمه" سے متاثر ہو کر۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں یہ

فرض بھی ٹھیک طور پر سرانجام نہیں دیا جا رہا۔ بچّوں کے لئے بازار میں دستیاب قرآنی قاعدے تک اغلاط سے مبرّا نہیں ہیں سوائے ایک آدھ کے

ضروری ہے کہ بچّوں کے لئے مدارس میں نطق صحیح اور قرأت صحیح کی مشق رکھنے والے قراء معقول مشاہروں پر رکھے جائیں۔ اور تلقی و سماع کے مسنون طریقے کا احیا کیا جائے۔

بچّوں کو صحتِ تلفظ اور نطقِ صحیح کے ساتھ قرآن حفظ کرانے کا بندوبست کرنا خدمتِ قرآن کا نہایت اہم میدان ہے۔ بدقسمتی سے بعض مجبوریوں کی وجہ سے اساتذۂ قرآن تلامذہ پر پوری توجہ نہیں دے سکتے۔

اسی طرح حفظِ قرآن کی حوصلہ افزائی کے علاوہ اس کی صحیح لائنوں پر تکمیل وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے۔

یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اکثر پڑھے لکھے لوگ قرأت قرآن سے ناآشنا نظر آتے ہیں حالانکہ اسلامی نظامِ تعلیم کی بدولت تو ہر قرآن خوان اپنی علاقائی زبان پڑھنے (ریڈنگ) پر قادر ہو جاتا تھا۔

● لکھنے اور پڑھنے کے بعد یا کتابت و قرأت کے علاوہ قرآن کی خدمت کا اگلا میدان قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ اس میدان میں اگلوں کی خدمات کا اندازہ کرنے کے لئے تراجم و تفاسیر قرآن کے ضخیم ذخائر کے علاوہ معاجم قرآن (ڈکشنری) اور قرآنی موضوعات پر مستقل تالیفات کی طرف اشارہ کرنا ہی کافی ہے۔

تاہم اتنے ذخیرہ کے فراہم ہو جانے کے باوجود کسی چیز کو حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا اور کسی بھی تفسیر یا ترجمہ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور ترجمہ یا تفسیر کی ضرورت نہیں۔

اس وقت ایک قابلِ غور امر جس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے یہ ہے کہ آج کی زندگی میں ماہرین کے پاس بھی ضخیم کتابوں کے مطالعہ کا وقت نہیں ہے۔ زندگی کے اس رواں دواں دور میں چھوٹے پمفلٹ یا مضامین وغیرہ کے ذریعے قرآنی تعلیمات کی اشاعت کا کام کیا جائے ـــــ اور درست قرآنی فہم کو عام کرنے کی کوشش

کی جائے۔

قرآن کریم کے سمجھنے سمجھانے کے سلسلے میں ہی خدمت قرآن کا ایک عظیم میدان عربی زبان کی تدریس و اشاعت ہے۔ قرآن کی برکت سے اور اس کی وجہ سے عہد نبوی کی عربی زبان ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی ہے۔

قرآن کی زبان کی خدمت کے لئے ہی مسلمانوں میں علم صرف و نحو کی ابتداء و ارتقاء کے منازل طے ہوئے اس مقصد کے لئے عربی معاجم کی تالیف، شعر جاہلیت کی تدوین وغیرہ کا سارا کام ہوا۔

مسلمانوں کے لئے عربی کی علمی و ادبی اور ملی و سیاسی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے غالباً آغا خان کی طرف سے یہ تجویز آئی تھی کہ پاکستان کی سرکاری زبان عربی بنائی جائے۔ ۱۹۵۱ء میں مشرقی پاکستان سے صوبائی اسمبلی کے ۶۵ ارکان نے اپنے دستخطوں کے ساتھ ایک قرارداد مرکزی حکومت کو بھیجی تھی جس میں عربی کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دینے کی سفارش کی گئی تھی پھر ۱۹۵۵ء میں کراچی کے متعدد رہنماؤں نے ایک مشترکہ قرارداد کے ذریعے مرحوم حسین شہید سہروردی سے عربی کو پاکستان کی سرکاری زبان بنا لینے کی اپیل کی تھی۔

اگر اس وقت عربی کو ملی اور دینی زبان کی حیثیت سے دوسری پدری اور مادری زبانوں پر ترجیح دی جاتی اور عربی کو سرکاری زبان بنا لینے کے کسی ۲۰، ۲۵ سالہ منصوبے کی بنیاد رکھ دی جاتی تو شاید آج پاکستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔

بہر حال عربی زبان کی تدریس و تعلیم کے مراحل اور درجات (LEVELS) اور مقاصد و غایات متعدد ہو سکتے ہیں۔

لیکن قرآن کو براہ راست سمجھنے کے لئے عربی زبان کی تعلیم کو پڑھے لکھے طبقے میں اتنی حد تک زیادہ سے زیادہ عام کرنا چاہیئے کہ ایک پڑھا لکھا مسلمان مختلف تراجم قرآن کے تقابلی حسن و خوبی کو جانچ سکے ورنہ کم از کم يَعْبُدُوْنَ اور يَدْعُوْنَ کا ایک ہی ترجمہ کرنے والوں کی غلطی یا گمراہی کو تو سمجھ سکے۔

والی دو ڈبائی کے لئے بھی سیکھی جا سکتی ہے اور پی ایچ ڈی کے لئے بھی — دونوں مقصد اپنی جگہ مفید ہیں مگر دوبئی والی عربی سے قرآن نہیں سمجھا جا سکے گا اور پی ایچ ڈی والی عربی پورے قرآن کا ترجمہ بالاستیعاب پڑھنے کی فرصت ہی نہیں پیدا ہونے دے گی ۔ قرآن فہمی کے لئے عربی سیکھنا نسبتاً آسان بھی ہے ۔ قرآن کریم کی پوری حرکات اور علامات ضبط کے ساتھ کتابت عربی سیکھنے میں مدد بھی دیتی ہے ۔ قرآن فہمی کے لئے صرف اور نحو کی حد تک عربی زبان کی مضبوط بنیاد پر تحصیل کے بعد پورے قرآن کے ترجمہ سے اس طرح گزرنا کہ صرف و نحو کی حد تک ہر بات سمجھ لی جائے ۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے جو انجمن خدام القرآن نے شروع کیا ہے ۔ اور قرآن کی خدمت کا ایک نیا میدان ہے ۔

پچیس سال تک کالج اور یونیورسٹی میں عربی و اسلامیات کی تدریس میں بسر کرنے اور ڈگری کی حد تک استعداد و اہلیت رکھنے کے باوجود بالاستیعاب الحمد سے والناس تک قرآن کے ایک ایک لفظ کو سمجھتے ہوئے گزرنے کا اس سے پہلے خود مجھے بھی موقع ہی نہیں ملا بلکہ فرصت ہی نہیں مل سکی تھی ۔

اس کورس میں اگر کسی طرح جلالین یا کوئی مختصر عربی تفسیری حاشیہ بھی پڑھا دیا جائے تو تو آئندہ عربی عبارت پڑھنے کی بھی راہ ہموار ہو جائے گی اور حسبِ ضرورت عربی تفاسیر سے استفادہ بھی ممکن ہو جائے گا ۔

موجودہ زمانے کے لحاظ سے قرآن کی خدمت کا ایک نہایت اہم اور ضروری میدان ، قرآن کی حقانیت کی حفاظت یا اس پر دشمنوں کے اعتراضات کا باطل شکن جواب دینا بھی ہے ۔ یوں تو خود قرآن نے اہلِ مکہ کے قرآن پر اعتراضات کا ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صرف الفاظ و عبارات کا جامہ بدل جائے تو اور بات ہے ورنہ اپنی اصل اور روح کے لحاظ سے آج کے دشمنوں کے تمام اعتراضات کے جواب کی اصل خود قرآن سے مل سکتی ہے ۔ عبدالجبار معتزلی (۱۵ھ) کی تنزیہ القرآن عن المطاعن سے لے کر عبدالفتاح قاضی اور ڈاکٹر عبدالفتاح اسماعیل شلبی اور عبدالعظیم زرقانی وغیرہ کا مستشرقین کے مغالطوں کے پردے چاک کرنا — یہ سب اسی میدان میں خدمتِ قرآن کے نمونے ہیں ۔

(باقی صفحہ ۶۶ پر)

ڈاکٹر ابصار احمد

۲ دو جدید الٰہیاتی مفکرین کا تقابلی جائزہ

مذہب اور مذہبی مسائل کا معروضی مطالعہ ہر دور میں اس دور کی علمی سطح کی مناسبت سے کیا جاتا رہا ہے۔ جدید دور کے انسان کو بھی مذہب اور مذہبی عقائد کے ناگزیر ہونے کا احساس ہے۔ چنانچہ مختلف مذہبی تہذیبوں میں انتہائی ذہین افراد اور اہل علم کی یہ متفقہ رائے ہے' کہ مذہب کی افادیت کا احساس ہونے کے باوجود مذہبی قضایا اور معتقدات کا معروضی اور سائنٹفک جائزہ ایک اہم علمی فریضہ ہے۔ عالم اسلام بھی ان علمی مساعی میں یورپ یا کسی اور تہذیبی خطے میں کی جانے والی علمی کاوشوں سے پیچھے نہیں۔ ہمارے اسلاف نے اس سلسلے میں شاندار کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مذہب کا علمی اور تقابلی مطالعہ کیا اور ان کے نتائج فکر ہماری راہنمائی کے لئے موجود ہیں۔ ان کے افکار ہمارے لئے ہمیشہ ثروت عقلی کا سامان بہم پہنچاتے رہیں گے۔

میرے اس مقالے کا اصل موضوع جدید مغربی فکر و فلسفہ میں مذہب سے متعلق دو اہم مفکرین..... کانٹ' اور سورن کر کیگارڈ..... کا مختصر تقابلی مطالعہ ہے۔ کانٹ کے فلسفیانہ اور الٰہیاتی افکار کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے خطبات۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ میں کئی جگہ کانٹ کا نہ صرف حوالہ دیا ہے۔ بلکہ اس کے خیالات کو شرح و بسط کے ساتھ نقد و بحث کا موضوع بنایا ہے۔ اور اکثر و بیشتر اس کے افکار سے اتفاق کیا ہے۔ موخر الذکر فلسفی کا اقبال نے اگرچہ بالصراحت ذکر نہیں کیا۔ لیکن میرا یہ تاثر ہے کہ اقبال نے کر کیگارڈ کا تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کیا ہو گا۔ کیونکہ اس کی تصانیف جرمن زبان میں ترجمے ہونے کے بعد اس صدی کے اوائل میں یورپ میں پھیل چکی تھیں۔ اور اقبال جرمن زبان پڑھنے لکھنے کی درمیانے درجے کی استعداد ضرور رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے خیالات سے بڑی حد تک متاثر معلوم ہوتے ہیں یہ رائے قائم کرنے میں مجھے پروفیسر نیاز عرفان صاحب کے ایک وقیع مضمون سے بھی از حد تقویت ملی جنہوں نے وجودیت کی تحریک کا اقبال کے افکار پر اثر اور

دونوں میں معتدبہ مماثلت دکھانے کی کوشش کی ہے۔[1]

یہاں ضمنی طور پر ایک غلط فہمی کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ قارئین میں بعض اصحاب بنیادی طور پر معترض ہو سکتے ہیں کہ فلسفہ مذہب یا الٰہیات میں غور و خوض جائز نہیں۔ چنانچہ بعض احادیث میں بظاہر الفاظ اسکی ممانعت آئی ہے اور اسلاف میں بعض جلیل القدر آئمہ نے علم کی موشگافیوں کی مذمت کی ہے۔ ان کے نزدیک مذہبی عقائد کے معاملے میں اصل اور فیصلہ کن چیز سمعیات دل کا یقین اور ایمان بالغیب ہیں، نہ کہ غور و تفحص اور عقل و استدلال۔ یہ بات بظاہر بڑی قوی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہم ذرا دقتِ نظر سے کام لیں تو ہمارے سامنے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ دینی مسائل میں غور و خوض نہ صرف جائز، برمحل اور موزوں ہے، بلکہ قرآن کا طرہ امتیاز ہی یہ ہے کہ اس نے جب بھی کسی دینی حقیقت کو پیش کیا ہے تو اس طرح مدلل اور مبرہن طور سے، کہ انکار کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ عقل و خرد کی ضیا افروزیوں سے بہرہ مند نہ ہونا مسلمانوں کا شیوہ نہیں، اسے کفار کی محرومی و نہی دستی قرار دیا گیا ہے۔ وہی حشر کے روز کف افسوس ملیں گے اور کہیں گے۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ (الملک)

(اگر ہم پیغمبر کی دعوت پر کان دھرتے اور سوچ سمجھ سے کام لیتے تو آج دوزخیوں میں نہ ہوتے)

متعدد آیات قرآنیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن غور و فکر اور تعقل و تدبر پر از حد زور دیتا ہے۔ قرآن و سنت کی ہدایات واضح اور مطابق عقل ہیں نہ کہ خلاف عقل۔ خود شریعت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقائد سے متعلق ایک جچا تلا اور واضح تصور قائم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایمانیات ہی کی بنیاد قطعیت، اثبات اور وضاحت پر نہیں ہوگی تو اس سے کسی محکم کردار و سیرت کی تشکیل سرے سے محال ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے اور تاریخ فلسفہ اس پر شاہد ہے کہ متعدد مشاہیر مفکرین مذہبی معاملات کے معاملے میں مجرد عقل و خرد کی نارسائیوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور وہ اس بات کا اعلان برملا کرتے ہیں کہ تنہا عقل کی روشنی سے ایمان و عقائد کی گتھیوں کو سلجھانا ناممکن ہے۔

اب میں جدید مغربی فکر کے دو اہم فلسفیوں... کانٹ اور کرکیگارڈ..... کے افکار کا نہایت مختصر جائزہ پیش کر کے یہ دکھاؤں گا کہ وہ کس طرح ایمان و مذہب کے بارے میں مجرد عقلیات اور منطق کی واماندگی کے قائل ہیں۔

کانٹ

اگر ہم کانٹ سے قبل فلسفہ مذہب کے مختلف مکاتب فکر کا مطالعہ کریں تو ان سب میں ہمیں یہ قدر مشترک نظر آتی ہے کہ ان کے نزدیک مذہب کی جان چند مابعد الطبیعاتی عقائد ہیں۔ یہ تصور

---

[1] بحوالہ مضمون "What is common between Existentialists and Iqbal"
از نیاز عرفان، پاکستان فلاسفیکل جرنل، جنوری ۱۹۶۳ء

کیا گیا کہ خدا اس کائنات کی علت اولیٰ اور اس کا پروردگار ہے۔ اور ہم اور ہمارے اعمال وافعال اس کائنات کا حصہ اور جزو ہیں۔ اس ذات کا اثبات اور علم مذہب کے لئے ضروری ہے۔ کانٹ نے ان تمام عقائد کو رد کر دیا۔ اس کے نزدیک مذہب کی روح مابعد الطبیعاتی علم نہیں بلکہ اخلاقی فرض سے وابستگی ہے۔ اخلاقی فرض ایک بلند ترین قدر ہے اور تمام الٰہیاتی عقاید اس کے مقابلے پر ثانوی اور اس کے مطابق ہونے چاہئیں۔ ان خیالات کو دنیائے فلسفہ میں واضح الفاظ میں پہلی بار پیش کرنے والا مفکر جرمن فلسفی کانٹ (۱۷۲۴ - ۱۸۰۴) تھا۔ جو دو مختلف فلسفیانہ روایات کا وارث تھا۔ ایک طرف تو عقلیت پسند فلسفہ اور الٰہیات تھے اور دوسری طرف تجرباتی سائنٹفک علوم کی منہاج یعنی تجربیت' کانٹ نے ان دونوں مکاتب فکر کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہیوم کے فلسفہ تشکیک سے بھی پوری طرح واقفیت رکھتا تھا۔ کانٹ کے فلسفہ مذہب میں اپنے مخصوص نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے نظریہ علم اور فلسفہ اخلاق کے اہم اجزا کا خلاصہ پیش کریں۔ تاکہ اس کی روشنی میں یہ ممکن ہو سکے کہ ہم مذہبی فلسفے کی اس نئی تعبیر کو سمجھ سکیں جسے کانٹ نے پیش کیا۔

کانٹ نے اپنا نظریہ علم اپنی کتاب "تنقید عقل محض" میں انتہائی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے تجزیئے کے مطابق وقوفی ذہن کی تشکیل وتعمیر ایک پیچدہ شے ہے جس میں تین ملکات (Faculties) ہیں جو آپس میں ایک خاص طریقے سے مربوط ہیں۔ ان میں سے ہر ملکہ تجربے پر اپنا صوری مواد عائد کرتا ہے۔ جس کا ہر معلوم شے میں موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اول' ملکہ حس پذیری (Sensibility) ہے۔ جو سب سے نچلے مرتبے یعنی بلاواسطہ ادراک میں تجربے کو منظم کرتا ہے۔ یہ زمان ومکان کی صورت مہیا کرتا ہے۔ کسی خاص شے کا ادراک محض چند احساسات کے غیر منظم ملغوبے کو حاصل کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ان احساسات کے مجموعے کو ہم وجودیت اور تسلسل کے ایک باقاعدہ نظام میں پیش کرتا ہے۔ ایک تختہ سیاہ کے ادراک کی مثال لیجئے۔ اس کا تجربہ ہمیں سیاہی کے ایک بے ترتیب مجموعے کا سا نہیں ہوتا جس کی کوئی شکل کوئی حجم اور کوئی اندرونی ساخت نہیں ہوتی۔ ایک مخصوص شے ہے جو ایک خاص مکان میں موجود اور زمان کے دوران میں قائم ہے۔ کانٹ کے خیال میں وہ چیز جس کے باعث وہ شے اول الذکر حیثیت رکھنے کی بجائے موخر الذکر صفات سے متصف ہوتی ہے' ملکہ حس پذیری ہے۔ جو احساسات کے خام مواد پر مکان اور زمان کی خصوصی صورتیں عاید کرتی ہے۔ محسوسات کے متعلق جو کچھ ذہن کو خارج سے حاصل ہوتا ہے وہ اس پر اپنی مہر ثبت کرتا ہے۔ وہ انہیں مکانی شے اور زمانی واقعے کی حیثیت سے سمجھتا اور پیش کرتا ہے۔

دوسرا ملکہ تفہیم (Understanding) ہے۔ یہ ملکہ حس پذیری کے وجود پر منحصر ہے اس کا عمل اس وقت اور اس مواد پر ہوتا ہے' جب وہ مکان وزمان کی صورتوں سے متاثر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے

باعث اس کے عمل پر کچھ حدود اور پابندیاں عاید ہوتی ہیں۔ کسی چیز کی تفہیم اس کے ادراک محض سے علیحدہ اور زیادہ ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ تفہیم میں کچھ ایسے تعلقات اور رشتے ہوتے ہیں جو مکان اور زمان کے تعلقات سے زیادہ اور وسیع تر ہوتے ہیں۔ اس ملکے کے وجود اور اس کے عمل کی سادہ ترین مثال علتی تفہیم ہے۔ جب دو واقعات علتی رشتے میں منسلک ہوتے ہیں تو اس وقت بلا واسطہ ادراکی سطح پر زمانی ترتیب کے علاوہ ان میں ایک اور جزو بھی موجود ہوتا ہے۔ جس کا اپنا ایک خاص اسلوب ہوتا ہے۔ یہ اضافہ تفہیم کے عمل کا نتیجہ ہے۔ کانٹ کے نزدیک بارہ ایسی صورتیں ہیں جو عمل تفہیم سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ انہیں "مقولات" (Categories) کا نام دیتا ہے۔ تیسرا ملکہ عقل (Reason) ہے۔ جو عمل تفہیم پر اسی طرح عائد ہوتا ہے۔ جس طرح عمل تفہیم ملکہ حس پذیری پر، عقل کا عمل اس وقت ہوتا ہے۔ جب پہلے احساس کا خام مواد مکان و زمان کی ترتیب پا چکتا ہے۔ اور اس کے بعد مقولات سے متاثر ہو جاتا ہے۔ روح، خدا اور بعض دوسرے "تصورات" عقل کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں جو صورتوں اور مقولات میں مضمر نہیں ہوتے۔ کانٹ کے نظریہ علم میں ہمیں زیادہ زور اس بات پر ملتا ہے کہ انسانی علم صرف مدرکات کی دنیا تک محدود ہے۔ اس لئے مابعد الطبیعات اور روایتی الٰہیات کس طرح بطور علم تسلیم کی جا سکتیں روح، خدا اور دوسرے مذہبی تصورات کی طرح خود دنیا (Universe) بھی کانٹ کی اصطلاح میں ایک "مشمولہ" (Constitutive) مقولہ نہیں بلکہ "انضباطی" (Regulative) نصب العین ہے۔ یعنی وہ انسانی ذہن کی اس عقلی دلچسپی کی علامت ہے جو خارجی مظاہر کے مجموعے کی تفہیم کی تکمیل کا تقاضا کرتا ہے۔ ایسے تصور کی مدد سے طبیعی تحقیق کا راستہ متعین ہوتا ہے جس کا انجام مکمل علم کی وحدت پر منتج ہوتا ہے اور یہی عقل کا فطری نصب العین ہے۔ یہی کیفیت خدا کے متعلق ہے جسے مذہبی شعور خالق و بدیع، خارجی مظاہر اور داخلی تجربات کا تشکیل دہندہ کہتا ہے۔ کانٹ کے خیال میں یہاں بھی ایک انضباطی نصب العین کارفرما ہے۔ اگر ہم تصور خدا کے مفہوم کو اس انضباطی تصور کے مضمرات تک محدود رکھیں تو پھر یہ تصور صحیح کہلا سکتا ہے۔ اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا موجود ہے۔ کانٹ باری تعالیٰ کے وجودیاتی استدلال (Ontological Arguments) کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اس استدلال کا تار و پود اس مفروضے پر مبنی ہے کہ خدا کا وجود اس کے کمال کو مستلزم ہے۔ لیکن کانٹ کا کہنا ہے کہ انتہائی کمال کے تعقل کے تجزیئے سے ہم "وجود" کا تصور حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اثبات باری تعالیٰ کا وجودیاتی استدلال بے کار ہو جاتا ہے۔ الغرض علمیاتی دائرے میں کانٹ نے عقلیت اور تجربیت کے درمیان جو مفاہمت کی کوشش کی اس میں تجربیت کا پلہ بھاری تھا۔ لیکن دوسری طرف اگر ہم اس کے فلسفہ اخلاق کا مطالعہ کریں تو اس میں ہمیں مذہبی تصورات کے ضمن میں زیادہ مثبت رائے ملتی ہے۔ مذہبی عقیدے کے وہی عناصر جن کو "تنقید عقل محض" میں وقوفی حیثیت سے ختم

کر دیا گیا تھا' ایک نئے لباس میں پھر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ فلسفہ اخلاق میں کانٹ کلیت اور لزومیت کے اصولوں پر زور دیتا ہے اور اخلاقی ذمہ داری کے قانون کو "حکم مطلق" (Categorical Imperative) کا نام دیتا ہے۔ کانٹ کے نزدیک سب سے اہم امر جو ہمیں اخلاقی ذمہ داری کے احساس سے مذہبی تصورات کی اس نئی تعبیر کی طرف راہنمائی کرتا ہے' یہ ہے کہ اخلاقی قانون فرض کی پیروی کے اصول کو تسلیم کرنے میں کائنات اور اس میں انسان کی حیثیت کے متعلق کچھ مفروضات مضمر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم ان کو نظری طور پر ثابت نہیں کر سکتے تاہم ان عقاید پر ایمان رکھنا اخلاقی نقطہ نگاہ سے از بس ضروری ہے۔

کانٹ صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ عقل محض کے تنقیدی تجزیئے کا نتیجہ دھریت اور الحاد نہیں' بلکہ محض تشکیک ہے۔ اس میں مذہبی مفروضے کا انکار مضمر نہیں اس کا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ اس مفروضے کی صحت یا عدم صحت کے متعلق انسان کوئی حتمی علم نہیں رکھتا۔ دوسری طرف اخلاقی قانون کو قبول کرنے کے مضمرات خود اس قانون کی طرح غیر مبہم اور ایجابی ہیں۔ کانٹ انہیں "عقل عملی کے مفروضات" کا نام دیتا ہے۔ وہ یہ واضح کرتا ہے کہ ایک خاص حالت کے سوا ان کو نظری تفہیم سے کم تر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ان کی صحت ایک یقینی اخلاقی ایمان کی سی ہے۔ عقل عملی کے مفروضات تین ہیں۔ ارادہ انسانی کی علت و معلول کی پابندیوں سے آزادی' روح انسانی کی بقا اور خدا کا وجود۔ اس طرح سائنس اور مذہب میں مطابقت پیدا کر کے کانٹ نے الٰہیات کی قلب ماہیت کر دی۔ الٰہیات کبھی محض ایک مابعد الطبیعی قسم کی خیال آرائی تھا' اب اس کی بنیاد مضبوط اخلاقی بصیرت پر استوار ہوئی۔ یہ ایک ایسا ایمان و یقین ہے جس کا اساسی مقصد ہماری اخلاقی زندگی کی توضیح اور وسعت و گہرائی ہے۔ مذہب اور مذہبی معتقدات کا کام اخلاقی وابستگی کو منور کرنا اور اسمیں ایک آفاقی سنجیدگی پیدا کرنا ہے۔

اب میں ایک دوسرے یورپی مفکر کے خیالات کا جائزہ اختصار سے پیش کروں گا۔

سورن کرکیگارڈ

ڈنمارک کے الٰہیاتی فلسفی سورن کر کیگارڈ (۱۸۱۳ - ۱۸۵۵) کو عام طور پر جدید وجودیت (Existentialism) کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں سائنس پر بے پناہ اعتماد کے ساتھ عقل پرستی کا شدید رجحان بھی موجود تھا۔ اور انہیں عام طور پر باہم مربوط تصور کیا جاتا تھا۔ اس صدی کی عقل پرستی (Rationalism) کا واضح ترین اظہار ہیگل کے فلسفے میں ہوا' جو عقل کی مطلقیت کا علمبردار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کے تمام مسائل محض عقل کی مدد سے حل کئے جا سکتے ہیں اور عقل حقیقت کا جزو مطلق ہے۔ لیکن وجودیوں کے خیال میں عقل کی مطلقیت میں یقین غیر عقلی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تجربہ اس امر کا شاہد ہے کہ عقل انسانی فطرت کا

ایک حصہ ہے اور اس کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ یوں اسے مطلق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی بنا پر کرکیگارڈ نے جو وجودیت کا سرخیل ہے ہیگل کی عقل پرستی پر شدید احتجاج کیا۔ وہ کہتا ہے کہ صداقت موضوعی ہے اور عقل اسے گرفت میں نہیں لے سکتی۔ بقول والٹر کاؤف مین' وجودیت کوئی ایک مدون فلسفہ نہیں۔ بلکہ روایتی مابعد الطبیعاتی فکر کے خلاف کئی مختلف بغاوتوں کا عنوان ہے۔ وجودیت کی تعریف کرنا نہ صرف مشکل بلکہ خود وجودی نقطہ نظر ہی کے خلاف ہے۔ کیونکہ تعریف کا مطلب "جوہر" کا بیان ہے۔ اور وجودیت انسان کے کسی جوہر کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔

وجودیت ہر قسم کے محض تجریدی' منطقی و سائنسی فلسفہ کی نفی ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ فلسفہ کو فرد کی زندگی' تجربے اور تاریخی صورت حال سے گہرے طور پر مربوط ہونا چاہیئے ۔۔ جس میں فرد خود کو پاتا ہے۔ فلسفہ ظن و تخمین کا کھیل نہیں' بلکہ ایک طرز حیات ہے۔ یہ سب کچھ لفظ "وجود" میں مضمر ہے۔ وجودی اعلان کرتا ہے کہ میں معروضی دنیا کی بجائے صرف اپنے حقیقی تجربے ہی کو جانتا ہوں۔ اس کے نزدیک صرف ذاتی ہی حقیقی ہے۔ اس لئے فکر کا آغاز زندگی کے تجربے اور ذاتی واردات سے ہونا چاہئے۔ وجودیت فرد کی بے مثال انفرادیت پر اصرار کرتے ہوئے فطرت اور طبعی دنیا کی عمومی خصوصیات کے مقابلے میں انسانی وجود کو بنیادی حیثیت دیتی ہے۔ وہ انسان کے چند اساسی موڈز جیسے بوریت' ناسیا' خوف' تشویش' تنہائی' بیگانگی وغیرہ پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ جو انسان کی فطرت اور کائنات سے اس کے تعلق کے بارے میں سوالات پیدا کرتے ہیں وجودی فکر کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر بختیار حسین صدیقی نے بہت صحیح لکھا ہے۔

> "وجودیت وہ طرز فکر ہے جو انسانی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی ترکیب کے ذہنی اور عقلی پہلوؤں کی بجائے جذبی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ عقل' تجربہ اور کلیت کے چکر میں پھنس کر دور ہی سے حقیقت کو ہاتھ لگا کر نکل جاتی ہے لیکن جذبہ وجود کے اندر گھس کر ہمیں دل کی گہرائیوں کا پتہ دیتا ہے۔ بعض جذبی کیفیات تو ایسی ہوتی ہیں جن کی حیثیت نفسیاتی کم اور وجودی زیادہ ہوتی ہے وہ ان مسائل پر روشنی ڈالتی ہے' جن کا تعلق براہ راست انسان کی اصل حقیقت اور اس کی منزل مقصود سے ہوتا ہے"۔

کرکیگارڈ کا فلسفہ وزیست باہم اس قدر مربوط ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے متمیز نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے بارہا اور متعدد پیراؤں میں اس امر پر اصرار کیا ہے۔ کہ فلسفیانہ تحقیق نہ تو نظاموں کی تشکیل ہے اور نہ تعقلات کا مجرد تجزیہ۔ یہ انفرادی وجود کا اظہار ہے۔ اسی لئے وہ اپنے افکار کے معروضی مطالعے کو ناپسند و ناممکن قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی فرد کے فلسفے کا تنقیدی مطالعہ نقاد

کے اپنے وجود کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں۔ کر کیگارڈ نے مروجہ عیسائیت پر شدید نکتہ چینی کی۔ کوپن ہاگن کے عیسائی سماج میں یہ گویا خداوند کے مقدس نمائندوں کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ اہل کلیسا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اور اس سے مناظرے اور مجادلے کا بازار گرم کر دیا پادریوں نے رسائل اور اخبارات میں کر کیگارڈ کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ کر کیگارڈ اپنے بارے میں اس زمانے میں کہا کرتا تھا۔ "میں ایک ایسا شہید ہوں جسے طعن وطنز سے قتل کیا گیا ہے۔" اس نے اپنے فلسفے کی بنیاد ہیگلی نظریات کی تردید پر رکھی ہے۔ تاہم میں اپنے مطالعے سے اس رائے پر پہنچا ہوں کہ اس نے ہیگل کے فلسفے کے جس قدر حصے کو مسترد کیا ہے اس سے کہیں بڑے حصے کو اپنایا ہے۔ کر کیگارڈ کے ذہن پر عظیم مابعد الطبیعاتی فلسفی ہیگل کے اثرات ظاہر و باہر ہیں۔ اس نے ہیگل کی اصطلاحات کا ایک بڑا حصہ ذہنی وراثت کے طور پر حاصل کیا تھا۔ اگرچہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آخری تجزیے میں ہیگل اعلیٰ ترین کلیت اور اپنی عالمی تاریخ کی منطق پر فرد کو بحیثیت ذی اختیار و صاحب ارادہ ہستی قربان کر دیتا ہے۔ فرد کی حیثیت اس کے نظام فکر میں سمندر میں ایک قطرے کی حیثیت ہو کر رہ جاتی ہے۔ کر کیگارڈ نے اس کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے کہا کہ ہیگلی فکر عملی زندگی میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ محض خیال کا فلسفہ فرد موجود کے لئے ایک موہوم تصور سے زیادہ اہم نہیں۔ خیال محض کی راہنمائی میں زندگی بسر کرنا ایسا ہی ہے جیسے یورپ کے ایک نقشے کی رہبری میں ڈنمارک کی سیر کرنا جس پر اسے ایک نقطے جتنا دکھایا گیا ہو۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ناممکن۔۔۔۔

ہیگل اور اس کے متبعین کی معروضیت پسندی اور کلیت کی جستجو کے برعکس کر کیگارڈ کے نزدیک فلسفہ ایک طرز حیات ہے۔ جس کی اساس انسان کے ذاتی تجربے اور اس کے تاریخی ماحول پر ہونی چاہئے عقل انسان کی راہنما نہیں ہو سکتی اس کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ ہمارے اعمال کا جواز پیش کرے۔ اس نے اپنی متعدد تصانیف میں یہ تصور پیش کیا کہ صداقت موضوعی ہے اور سچا وجود شدت احساس سے حاصل ہوتا ہے۔ اس نے ایک فرد کی زندگی کو تین اقسام میں پیش کیا ہے اور ہر قسم حیات کی نہایت خوبصورت اور باریک بینی سے وضاحت کی ہے۔

۱۔ جمالیاتی دور یا قسم (۲) اخلاقی دور (۳) مذہبی دور

جمالیاتی طرز حیات لاپرواہی اور عیش کوشی کا طرز عمل ہے۔ یہ ان لوگوں کا رویہ ہے جن کی زندگی معین اخلاقی اصولوں اور ضابطوں سے عاری ہونے کی بنا پر تسلسل و ہم آہنگی سے محروم ہوتی ہے۔ جمالیاتی فرد کا نصب العین اس کے جبلی تقاضوں اور ہنگامی ضرورتوں کی براہ راست تشکیل ہوتی ہے۔ نتیجتاً اس قسم کے فرد کی زندگی اہمیت و معنویت سے قطعاً محروم ہوتی ہے وہ شخص جو ذہن صالح کا مالک ہوتا ہے، جلد ہی اس طرح کی زندگی سے اکتا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض افراد ہمت اور فکرو

تدبر سے کام لے کر اخلاقی سطح پر بسر کی جانے والی زندگی تک ابھر آتے ہیں۔ اس سطح پر آوارہ و سرگرداں فرد کائناتی اخلاقی ضابطے کو تسلیم کر لیتا ہے جس سے اس کی زندگی توازن و تواتر سے ہم آغوش ہوتی ہے۔ گو فی الحال ذات باری تعالیٰ سے اس کا تعلق استوار نہیں ہوتا ۔ اس قسم یا دور حیات میں انسان ایسی پابندیاں قبول کر لیتا ہے جیسے معاشرے، روایت اور قانون کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ یہ زندگی منظم سماجی روایت کو تسلیم کرنے اور زن و مرد کے جذبات و تعلق میں استقلال کی نشوونما میں معاون ہوتی ہے۔ اس سطح زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ فرد اپنی نجی زندگی کی حدود سے ماوراء ہو کر اپنی جزئی ہستی میں کلیت کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ مگر بالآخر یہ مرحلہ بھی محدود ثابت ہوتا ہے۔ فرد کمال خودی کا متلاشی ہے اخلاقی دور میں یہ آرزو پروان نہیں چڑھتی۔ یوں تیسرے مرحلے کی ضرورت پیش آتی ہے جسے کرکیگارڈ نے "مذہبی مرحلہ" کا نام دیا ہے۔ اس نظریئے کے مطابق مذہبی دور کسی تجریدی کائناتی ضابطے کی بجائے خدا کے حضور سربسجود ہوتا ہے وہ اپنے تئیں مخلوق تصور کرتے ہوئے خدا کے حضور اس کی بندگی کا اقرار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اخلاقی قانون سے ماوراء ہو جاتا ہے حضرت ابراہیم کی قربانی اس کی روشن مثال ہے جنہوں نے تورات کی روایت کے مطابق اپنے بیٹے اسحٰق کو قربان کرنے کی کوشش کی تھی۔ اخلاقی قانون کی رو سے قتل ایک جرم ہے۔ تاہم انہیں بخوبی علم تھا کہ بندے اور رب کا رشتہ اخلاقی قانون کا پابند نہیں۔ یہ اس سے ماوراء اور اعلیٰ تر ہے۔ خدا کے ساتھ اس ایمانی تعلق کے اثبات ہی سے انسان کو عرفان ذات حاصل ہوتا ہے۔

کرکیگارڈ کا خیال یہ ہے کہ زندگی کے ان تینوں ادوار میں جدلیاتی عمل موجود ہے لیکن یہ عقلی نہیں، وجودی جدلیت ہے۔ یعنی ان ادوار کے مابین حائل فاصلے کو عقل و استدلال کی مدد سے طے نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں عقل کو چارہ کار نہیں۔ اگرچہ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ عقل کو کلی طور پر مسترد کر دیتا ہے۔ وہ صرف عقل سے بڑھی ہوئی عقل پرستی کا مخالف ہے۔ وہ بجا طور پر کہتا ہے کہ عقل ہمیں ایمان کی حد تک لے آتی ہے لیکن آگے چھلانگ لگانے یا نہ لگانے کا فیصلہ ہر فرد کو خود کرنا ہے۔ اس مرحلے پر کوئی دوسرا فرد، روایتی مذہب، رسم و رواج، یا عقلی دلائل رہبری نہیں کر سکتے۔

سطور بالا سے آپ پر بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ عصر حاضر میں یورپ کے دو اہم فلسفی مذہبی معتقدات کے بارے میں بالعموم اور ذات و وجود باری تعالیٰ کے بارے میں بالخصوص عقل و تفکر کی نارسائیوں کے قائل ہیں۔ اور مذہب کے باب میں اخلاقی فرضیت کے احساس اور اندرونی نفسیاتی کیفیات کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور اس طرح جدید فکر کی دو اہم شخصیتیں علم و ادراک باری تعالیٰ کے بارے میں اسی موقف کی تائید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جو ہمیں اپنے دین سے ملتی ہیں اور جنہیں حضرت ابوبکرؓ نے اپنے قول میں اس طرح ادا کیا ہے: العجز عن درک الذات ادراک اور

(باقی صفحہ ۸۶)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

منشورِ اسلام

(۵)

غلط نصب العین سے محبّت کرنے کے خطرات زندگی اور اسکی اقدار کے متعلق غلط نقطہ نظر

(ا) جب کوئی فرد یا کوئی قوم انبیا کی دعوت کو نظر انداز کر دے اور کسی غلط نصب العین سے محبّت کرنے لگ جائے تو اس حالت کو اسلام کی اصطلاح میں کفر کہا جاتا ہے۔

نصب العینوں کی جن خصوصیات کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اُن سے آشکارا ہے کہ کسی غلط نصب العین کی محبّت یا کفر کی حالت اس فرد یا قوم کے لیے جو اسے اختیار کرے نہایت ہی خطرناک نتائج پیدا کرتی ہے۔ مختصر طور پر یہ نتائج حسب ذیل ہیں:۔

(ا) چونکہ ایک غلط نصب العین دراصل حسن کی تمام صفات سے عاری ہوتا ہے اور اس کا چاہنے والا ان صفات کو اس کی طرف محض ایک غلطی کی بنا پر منسوب کر رہا ہوتا ہے لہٰذا جو فرد اس سے محبّت کرتا ہے وہ اس کی صفات کو اپنی عملی زندگی میں اُجاگر کرتے ہوئے انسانی زندگی اور اس کی اقدار کے متعلق ایک غلط نقطہ نظر پیدا کر لیتا ہے۔ حسن، خیر اور صداقت کے لیے اس کی فطرت کا جذبۂ محبّت پوری آزادی کے ساتھ اور مکمل طور پر اپنا اظہار نہیں پا سکتا کیونکہ اس کا ناقص نصب العین جو ان صفات سے عاری ہوتا ہے ان کے اظہار کے ساتھ مزاحمت کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عدل، دیانت داری، سچّائی، مساوات، آزادی، نیکی اور اخوّت ایسی اخلاقی اقدار کے صحیح تقاضوں کے متعلق اس کے اندازے اور فیصلے غلط ہو جاتے ہیں وہ اپنی غلط قسم کی محبّت سے نادانستہ طور پر اور ایک غیر محسوس طریق سے مجبور ہوتا ہے کہ ان

اصطلاحات کو غلط اور محدود اور تنگ نظرانہ معنی پہنائے اور لہٰذا ان کو اخلاق کے بلند معیار سے نیچے گرا کر شر انگیزی کا ذریعہ بنائے۔ وہ ان اوصاف کے صحیح مطالبات کو عملی طور پر نظر انداز کرتا ہے اپنی بہترین نیتوں اور بہترین کوششوں کے باوجود اس کے افعال غلط مقاصد کے لیے صادر ہونے لگتے ہیں۔ اس کے فکر و عمل کی قوتیں جن پر اس کا غلط نصب العین حکمران ہوتا ہے۔ غلط طور پر کام کرتی ہیں اور غلط نتائج پیدا کرتی ہیں۔ وہ اس چیز سے نفرت کرتا ہے جو درحقیقت قابلِ ستائش اور لائق محبت ہوتی ہے اور اس چیز سے محبت کرتا ہے جو درحقیقت زشت نامحمود ہوتی ہے۔ اشیا کے متعلق اس کا زاویہ نگاہ بگڑ جاتا ہے اور اشخاص اور حقائق کے متعلق اس کا خیال ٹھوکریں کھانے لگتا ہے۔ اپنی غلط محبت کے دباؤ کی وجہ سے نہ وہ ٹھیک طرح سے دیکھ سکتا ہے۔ نہ سن سکتا ہے نہ سوچ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے اور نہ کام کر سکتا ہے اور پھر سب سے بڑی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی غفلت کے عالم میں ہوتا ہے کہ اسے اپنی ان کوتاہیوں اور مجبوریوں کا قطعاً کوئی علم نہیں ہوتا وہ گویا ایک حیوان کی طرح ہوتا ہے جسے اس کا غلط نصب العین جس طرف چاہے ہانک کر لے جاتا ہے بلکہ حیوان بھی اتنا گمراہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ بھی قدرت کی عطا کی ہوئی جبلتوں کے مطابق عمل کرتا ہے اور اس کا عمل قدرت کے مقاصد سے ہٹا ہوا نہیں ہوتا۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (الاعراف: ۱۷۹)

ان کے دل ہیں جن سے سوچتے نہیں اور اُن کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے نہیں۔ اور ان کے کان ہیں جن سے سنتے نہیں۔ وہ حیوانات کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہی لوگ ہیں جو اپنی گمراہی سے بھی بے خبر ہیں۔

چونکہ نصب العین انسان کے ہر فعل کا سرچشمہ ہے اور اس کی قدر و قیمت کو معین کرتا ہے لہٰذا انسان کا ہر فعل اتنا ہی اچھا یا بُرا ہوتا ہے جتنا کہ وہ نصب العین اچھا یا بُرا ہوتا ہے جس سے وہ صادر ہوتا ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ اس شخص کا کیرکٹر بھی حقیقی طور پر عمدہ یا بلند نہیں ہو سکتا جو ایک ناقص اور غلط نصب العین سے محبت کر رہا ہو۔ مثلاً جس شخص کا نصب العین کوئی قوم ہو جو کسی خاص خطۂ زمین میں بس رہی ہو اور اپنے چمڑے کی ایک خاص رنگت رکھتی ہو اور ایک خاص نسل سے تعلق رکھتی ہو اور ایک خاص زبان بولتی ہو۔

اس کا تصوّر صداقت یا عدل یا حریت یا مساوات کبھی اتنا وسیع نہیں ہو سکتا کہ اُن لوگوں پر بھی حاوی ہو جائے جو اس ملک یا رنگ یا نسل یا زبان سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ صداقت، عدل، حریت یا مساوات کا کوئی ایسا تصوّر اس کی محبت یا کوشش کے لائق نہیں جو اس کی اپنی قوم کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کو فائدہ پہنچاتا ہو یا اس کی اپنی قوم کے مفاد کی قیمت پر کسی دوسری قوم کی عظمت کا اہتمام کرتا ہو۔

خدا کی محبت صرف ایک ہی سرچشمہ ہے جس سے اخلاقی اقدار کی محبت جو انسان کی فطرت میں ہے وہ قوت حاصل کر سکتی ہے جو ان اقدار کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ جو شخص کسی غلط اور ناقص نصب العین سے محبّت کر رہا ہو وہ بھی ہمہ گیر اخلاقی اصولوں سے مطابقت رکھنے والے عمدہ اخلاقی عمل کی فطری خواہش تو رکھتا ہے لیکن اس کی یہ خواہش اس کی غلط محبّت سے دب جاتی ہے اور لہٰذا وہ اس کے تقاضوں کا صحیح ادراک یا اُن کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف غلط نصب العینوں کے چاہنے والے اس بات پر اتفاق نہیں کر سکتے کہ صداقت، عدل، حریت اور مساوات ایسی اصطلاحات کا صحیح مفہوم کیا ہے اور وہ کس قسم کے عمل کا تقاضا کرتی ہیں اور ایسی حالت میں جب کہ وہ ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہوتے ہیں۔ نہایت اخلاص اور دیانت داری کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ ان اخلاقی اقدار کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے قربانیاں پیش کر رہے ہیں جن پر یہ اصطلاحات دلالت کرتی ہیں۔

غلط اور ناقص نصبُ العین کی محبّت نہ مکمّل ہو سکتی ہے اور نہ مستقل طور پر قائم رہ سکتی ہے

(۲) ایک ایسے شخص کی محبت جو کسی غلط اور ناقص نصب العین کو اختیار کر لیتا ہے نہ تو اپنے مکمل کمال پر پہنچ سکتی ہے اور نہ ہی تادیر قائم رہ سکتی ہے۔ کامل اس لیے نہیں ہو سکتی کہ وہ حسن بخیر اور صداقت کے لیے اس کے فطری جذبۂ محبت سے جو اسے مطلق اور عالمگیر اخلاقی اصولوں کے مطابق عمل پر اکساتی ہے مطابقت نہیں رکھتی اور اندر ہی اندر اس کے ساتھ متصادم ہوتی رہتی ہے لہٰذا وہ اپنی غلط محبت کی وجہ سے اپنے اس فطری جذبۂ محبت کی مکمل تشفی نہیں کر سکتا اس کے

علاوہ حسن کے وہ اوصاف جن کی موجودگی کا وہ شعوری احساس نہیں رکھتا اور جن کو وہ اس کی طرف فقط اپنی غلطی کو مکمل کرنے کے لیے بلاوجہ اور غیر شعوری طور پر منسوب کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی محبت کی نشوونما میں ایک رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور اسے ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ لہٰذا وہ اپنے غلط نصب العین کے ساتھ دل و جان سے محبت نہیں کر سکتا بلکہ اس کے لیے ایک مخفی غیر شعوری نفرت جو بعد میں آشکار اور باشعور ہو جاتی ہے اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی غیر مطمئن رہتی ہے اور وہ بہت جلد خوف، غم، پریشانی بلکہ ہسٹیریا۔ ذہنی مجادلہ اور دوسرے اعصابی امراض میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا (آل عمران: ۱۵۱)

عنقریب ہم کافروں کے دلوں میں خوف پیدا کر دیں گے اس بنا پر کہ انہوں نے اس چیز کو خدا کا شریک ٹھہرایا جس کے لیے اس نے کوئی دلیل نازل نہیں کی تھی۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (طٰہٰ: ۱۲۴)

جس شخص نے میرے ذکر سے روگردانی کی اُسے ایک دشوار زندگی کا سامنا کرنا ہوگا اور ہم قیامت کے دن (بھی) اسے اندھا بنا کر اٹھائیں گے۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ۝ (الزخرف: ۳۶)

جو شخص خدا کے ذکر سے منہ موڑ لیتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حسن سے محبت کرنے کے یہ دونوں طریقے (جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے (یعنی نصب العین کے حسن پر غور و فکر اور نصب العین کے حصول کے لیے عمل) ایک غلط نصب العین کی محبت کو بھی کچھ عرصہ کے لیے ترقی دیتے ہیں لیکن اس کی ترقی جلد ہی ایک مقام

پر پہنچ جاتی ہے جس سے آگے نہیں جا سکتی بلکہ جہاں پہنچ کر یہ طریقے اس کی محبت میں اضافہ کرنے کی بجائے اس کے نقائص کو آشکار کرنے اور اس کی نفرت پیدا کرنے اور اسے ترقی دینے کا نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔

ایک غلط نصب العین زود یا بدیر فرد اور قوم کی زندگی کے ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں

(۳) ایک غلط نصب العین کے ناز یبا اوصاف جو اس کو چاہنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود ان کے اعمال کی نوعیت کو معین کرتے رہتے ہیں ان کی زندگی کے خارجی حالات کے آئینے میں آشکار ہو جاتے ہیں اس لیے ایک غلط نصب العین ایسے قومی اور بین الاقوامی حالات پیدا کرتا ہے جو انسانوں کے بڑے بڑے گروہوں کو مصیبت اور پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ایک غلط نصب العین دراصل ہر پہلو سے اور مکمل طور پر ناکام ہوتا ہے کیونکہ وہ زندگی کے خارجی حالات میں حسن کے ان اوصاف کو کبھی آشکار نہیں کر سکتا جو اس کے چاہنے والے اس کی طرف شعوری طور پر اور دیدہ دانستہ منسوب کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نصب العین کے وہ نقائص جو اس کی فطرت میں مضمر ہوتے ہیں ان اوصاف کے ساتھ ٹکراتے ہیں اور ان کے کامیاب عملی خارجی اظہار کو ناممکن بنا دیتے ہیں۔

جنگ جوئی اور خون ریزی کا اصل سبب

(۴) صحیح اور سچا نصب العین صرف خدا ہے جو ایک ہے لیکن غلط اور جھوٹے نصب العین جو انسان کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتے لاتعداد ہیں اور ان میں سے بہت سے بیک وقت ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو موجود ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ان غلط نصب العینوں میں سے ہر ایک اپنا ایک ضابطۂ اخلاق و عمل رکھتا ہے اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے غیر محدود قوت اور توسیع کا متمنی ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا ضابطۂ اخلاق و عمل پوری دنیا میں قبول

کر لیا جائے۔ لہٰذا ہر نصب العینی جماعت دوسری تمام نصب العینی جماعتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاتی ہے اور تمام نصب العینی جماعتیں ایک غیر متناہی جنگ میں اُلجھ جاتی ہیں اور جُوں جُوں انسانوں کو بڑی تعداد میں ہلاک کرنے کے آلات قوّت اور اثر میں ترقی کرتے جاتے ہیں نصب العینوں کی یہ غیر متناہی جنگ بھی زیادہ سے زیادہ انسانوں کی خون ریزی اور تباہی کا سبب بنتی جاتی ہے

جو قوم غلط نصب العین پر قائم ہوتی ہے اس کا آخر کار مٹ جانا ضروری ہوتا ہے

(۵) وہ قوم جو کسی غلط نصب العین کی محبت پر قائم ہو تا دیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ممکن ہے کہ وہ کئی صدیوں تک زندہ رہے لیکن فطرت انسانی کے ناقابل تغیر قوانین کے عمل کی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ آخر کار نیست و نابود ہو کر رہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ج اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ

(یونس: ۴۹)

ہر قوم کے لیے جو کسی غلط نصب العین کی پرستار ہو ایک مدت حیات ہوتی ہے جب ان کی موت ختم ہونے کا لمحہ آتا ہے تو وہ نہ اس کے پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے نکلتے ہیں۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝ (ابراہیم: ۲۶)

ایک ناپاک کلمے یعنی ایک ناپاک اعتقاد یا نصب العین کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک ناکار درخت جسے زمین سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور اسے کوئی ثبات یا قرار نہیں ہوتا۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ط وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۴۱)

ان لوگوں کی مثال جو خدا کو چھوڑ اوروں کو یعنی اور نصب العینوں کو دوست بناتے ہیں ایک مکڑی کی طرح ہے جو اپنے لیے گھر بناتی ہے اور یقیناً سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا ہی گھر ہوتا ہے کاش کہ یہ لوگ جانتے۔

لہٰذا وہ ساری قربانیاں جو ایک غلط نصب العین کے پرستار اس کے لیے کرتے ہیں

رائیگاں جاتی ہیں وہ مجبور ہوتے ہیں کہ خود اپنے ہاتھوں سے عمارت کو ڈھائیں اور برباد کریں جسے وہ صدیوں کی محنت شاقہ کے بعد کھڑا کرنے کے قابل ہوئے کیونکہ انہوں نے نہیں دیکھا تھا کہ اس عمارت کی دیواریں ٹیڑھی ہیں اور وہ ان کے ذوق حسن کو مطمئن نہیں کرسکے گی اور ان کے کسی کام نہیں آسکے گی۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک بڑھیا جو بڑی محنت اور بڑے شوق سے سوت کاتتی ہے اور پھر جب کات لیتی ہے تو اپنے ہی ہاتھوں سے اُسے نوچ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (النحل: ۹۲)

اس عورت کی طرح نہ بنو جو اپنے سوت کو مضبوطی سے کاتنے کے بعد کھول کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

یہ لوگ جب تک اپنے غلط نصب العین کی خدمت میں قربانیاں پیش کر رہے ہوتے ہیں تو کسی کی پند و نصیحت سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے کیونکہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں بالکل درست ہے لیکن درحقیقت وہ اپنی زندگی کو ضائع کر رہے ہوتے ہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝

(الکہف: ۱۰۳، ۱۰۴)

کہیے کیا میں تم کو ان لوگوں کا حال بتاؤں جن کے اعمال سب سے زیادہ نقصان رساں ہیں یہ لوگ وہ ہیں جن کی تگ و دو اس دنیا کی زندگی کے لیے صرف ہو کر رہ گئی ہے اور اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ نہایت اچھے کام کر رہے ہیں۔

وہ اپنے نصب العین سے مخلصانہ اور والہانہ محبت کرتے ہیں لیکن اس کا انجام فقط یہ ہوتا ہے کہ وہ نصب العین انہیں فریب دے کر چھوڑ جاتا ہے اور ان کو اپنی غلط محبت کی قیمت اپنی جان سے ادا کرنی پڑتی ہے اور اس کے عوض میں وہ فقط تباہی اور بربادی کو مول لیتے ہیں۔ قرآن حکیم بار بار ایسی قوموں کا ذکر کرتا ہے جن کو دنیا سے اس لیے رخصت ہونا پڑا کہ وہ خدا کو چھوڑ کر غلط نصب العینوں سے محبت کرتے تھے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ۝ (الروم: ۴۲)

کہیے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا ہے جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں اور جو خدا سے شرک کیا کرتے تھے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ (الانعام: ۶)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی نسلوں کو ہلاک کر دیا ہے جن کو ہم نے زمین پر اس طرح سے تمکن کیا تھا کہ تم کو بھی ویسا نہیں کیا اور ہم نے ان پر آسمان سے موسلا دھار مینہ برسائے اور دریاؤں کو ان کے قدموں پر جاری کیا پس ہم نے اُن کو اُن کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد اور نسلوں کو پیدا کر دیا۔

غلط نصب العین پر قائم ہونے والی ریاست میں سچّی آزادی ممکن نہیں

(۶) ایک ایسی ریاست جو کسی غلط نصب العین پر مبنی ہو فرد کو سچّی آزادی نہیں دے سکتی۔ ایسی ریاست میں فرد ظاہری طور پر آزاد ہوتا ہے لیکن در اصل وہ ریاست کے غلط نصب العین کا غلام ہوتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اپنی غلط تعلیم کی وجہ سے وہ اپنے غلط نصب العین کو پسند کرنے لگ جاتا ہے اور اپنی غلامی کو آزادی سمجھ کر اس سے پوری طرح رضامند ہو جاتا ہے اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسے نصب العین کا غلام بن گیا ہے جو اس کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا اور اُسے اپنے غیر فطری اور غلط ضابطۂ اخلاق کی پیروی پر مجبور کر رہا ہے۔

اگر آزادی کا کوئی مطلب ہو سکتا ہے تو وہ سوائے اس کے کوئی اور نہیں، ہو سکتا کہ کوئی انسان اپنی اس آرزو کو مطمئن کرنے کے لیے مکمل اور مستقل طور پر آزاد ہے جو آخر کار اس کی فطرت کی صرف ایک ہی آرزو ہے اور یہ آرزو خدا کی آرزو ہے۔ ان بیرونی قوتوں میں جو اس آزادی

کے ساتھ مزاحمت کرتی ہیں، نہ صرف غلط نصب العین پر قائم ہونے والی ریاست کا قانون شامل ہوتا ہے جو اسے اس کی فطرت کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرتا ہے بلکہ وہ نظامِ تعلیم (جس میں سماجی ماحول بھی داخل ہے) بھی شامل ہوتا ہے جو اسے نادانستہ طور پر ایسی خواہشات کو دل میں جگہ دینے پر مجبور کرتا ہے جو اس کے فطری جذبۂ محبت کے تقاضوں کے خلاف ہوتی ہیں۔

ایک غلط نصب العین کی محبّت انسان کی بعد از مرگ زندگی کو دشوار بناتی ہے

(۷) اس آدمی کے افعال جو ایک غلط نصب العین سے محبت کر رہا ہو نہ صرف یہ کہ آخرکار اس دنیا میں اس کے کسی کام نہیں آتے بلکہ وہ اس کی اگلی دنیا کی زندگی میں بھی اس کی ترقی اور خوشی کے راستہ میں ناقابلِ عبور، دلدوز اور دردانگیز رکاوٹوں کا سامان بن جاتے ہیں۔

نوعِ انسانی کے بقا کی ایک لازمی شرط

اگر ہم فقط انسان کی اس دنیا کی زندگی کو ہی زیرِ غور لائیں تو پھر بھی غلط نصب العینوں سے محبت کرنے کے نقصانات اتنے شدید ہیں کہ اس میں ذرا شک نہیں رہتا کہ اگر قدرت انبیاء کو بھیج کر انسان کی اس کوشش کی صحیح راہ نمائی کا اہتمام نہ کرتی جن کے ذریعہ سے وہ نصب العین کی محبت کے فطری جذبہ کی تشفی کرتا ہے تو اس بات کی کوئی امید نہ ہو سکتی کہ نوعِ انسانی تا دیر کرۂ ارض پر زندہ رہ سکے گی۔ لیکن اب جبکہ خدا کی رحمت سے نبوّت کی ہدایت دنیا میں موجود ہو چکی ہے صورتِ حال مختلف ہے۔ جس قدر زیادہ نوعِ انسانی اپنے مختلف گروہوں کے باہمی دشمنیوں اور رقابتوں کی وجہ سے اپنی ہلاکت اور بربادی سے قریب آتی جائے گی (اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت وہ دن بدن اس سے زیادہ قریب آتی جا رہی ہے) اسی قدر زیادہ وہ اس بات پر مجبور ہو گی کہ اس خطرناک صورتِ حال کا کوئی مؤثر اور کامیاب علاج تلاش کرے اور اس کا مؤثر اور کامیاب علاج اسے صرف تعلیمِ نبوّت میں ہی مل سکے گا جو انسان کی خوش قسمتی سے پہلے ہی موجود ہے۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (العصر)

قسم ہے زمانہ کی، انسان یقیناً بڑے نقصان میں ہے سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان رکھتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو اتباعِ حق کی تلقین کرتے ہیں اور صبر سے کام کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝ (انبیاء: ۱۰۷)

اور ہم نے تمہیں آپ کو تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

صحیح نصب العین سے محبت کرنے کی برکتیں

جب کوئی انسانی فرد یا انسانوں کا گروہ انبیا کی دعوت کو قبول کر لیتا ہے اور خدا کے سچے نصب العین سے محبت کرنے لگ جاتا ہے تو اس حالت کو اسلام کی اصطلاح میں حالتِ ایمان کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسا فرد انسانی یا ایسا انسانی گروہ صاف اور سیدھی سڑک پر چل نکلتا ہے جو اس کے انتہائی ہمہ گیر کمال کی طرف جاتی ہے اور آخر کار وہ اتنا کامل اور بے عیب ہو جاتا ہے جتنا کہ ہم کسی فرد یا گروہ کے کامل اور بے عیب ہونے کا تصور کر سکتے ہیں۔

زندگی اور اس کی اقدار کا صحیح نقطۂ نظر

وہ انسان جو خدا کے صحیح نصب العین سے سچی محبت کرتا ہے زندگی اور اس کی قدروں کے متعلق صحیح نقطۂ نظر پیدا کر لیتا ہے۔ اشیا اور اشخاص کے متعلق اس کا زاویۂ نگاہ درست ہو جاتا ہے اور اس کے الفاظ اور افکار اور افعال درست ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی چیزوں سے محبت کرتا ہے جو درحقیقت ستائش اور محبت کے قابل ہوتی ہیں اور ایسی چیزوں سے نفرت کرتا ہے جو درحقیقت زشت اور قابلِ نفرت ہوتی ہیں۔ صرف ایسا شخص ہی نیکی، سچائی، عدل، مساوات، اخوت، حریت وغیرہ اصطلاحات کے معنی صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور پوری طرح سے ان کی اہمیت اور ضرورت محسوس کر سکتا ہے۔ وہی اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے نصب العین کو وہ تمام محبت پوری طرح سے دے سکے جس کی استعداد اس کی فطرت میں رکھی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ اپنے نصب العین

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

(۵)

حکمتِ اقبال

غلط فلسفہ بھی غلط محبت سے پیدا ہوتا ہے

جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا ہے تصورِ حقیقت کا عشق صرف اس فلسفی کا ہی امتیاز نہیں ہوتا جو صحیح تصورِ حقیقت کو اپنے فلسفہ کی بنیاد بنا رہا ہو بلکہ استدلال کی ظاہری اور عارضی قوت جو ایک غلط فلسفہ کو حاصل ہوتی ہے وہ اس کے موجد کے اس عشق ہی کی وجہ سے ہوتی ہے جو اسے اپنے غلط تصورِ حقیقت سے ہوتا ہے۔ اس عشق کی وجہ سے وہ ان سچے حقائق سے آنکھیں بند کر لیتا ہے جو اس کے غلط تصورِ حقیقت سے مطابقت نہ رکھتے ہوں اور ان غلط حقائق کو صحیح سمجھ لیتا ہے جو اس کے غلط تصورِ حقیقت سے مطابقت رکھتے ہوں۔ مثلاً اگر کارل مارکس کو اپنے غلط تصورِ حقیقت سے عشق نہ ہوتا تو وہ ہرگز ایسا فلسفہ نہ لکھ سکتا جو قطعی طور پر غلط ہونے کے باوجود آج کروڑوں بندگانِ خدا کی زندگیوں کا مدار محور بنا ہوا ہے۔

اب غور کیجئے کہ ایک طرف سے تو کائنات کا صحیح فلسفہ انسان کی شدید ترین نظری اور عملی ضروریات میں سے ہے اور دوسری طرف سے اس کے بہم پہنچنے کی راہ میں ناقابلِ عبور دشواریاں ہیں لیکن قدرت کا قاعدہ ہے کہ انسان کی ہر شدید قدرتی ضرورت کی تشفی کے لیے وہ اپنا انتظام کرتی ہے اور اس التزام کی بنیاد بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر قدرت ایسا نہ کرے تو کائنات میں اس کے مقاصد کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح سے قدرت ہماری شدید بدنی ضروریات کی تکمیل کے لیے بادل۔ ہوا۔ سورج۔ چاند۔ زمین اور آسمان ایسی قوتوں کو کارفرما کرتی ہے اسی طرح سے وہ ہماری شدید روحانی ضروریات کی تشفی کے لیے انبیاء کا سلسلہ قائم کرتی ہے۔

اس کتاب میں آگے چل کر اقبال کے نظریۂ نبوت کی پوری تشریح کی جائے گی یہاں صرف یہ گزارش کرنا مقصود ہے کہ حضرت انسان کے لیے ہر نبی کا سب سے پہلا اور سب سے آخری اور سب سے زیادہ قیمتی تحفہ حقیقتِ کائنات کا صحیح تصور ہوتا ہے اسی تصور کو ہم خدا کا تصور کہتے ہیں

اس تصور کی پوری حقیقت اس کے عملی اخلاق سے ہی سمجھ میں آتی ہے اور اس کا عملی اطلاق جس کا ظہور سب سے پہلے نبی کی عملی زندگی کی مثال میں ہوتا ہے اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ انسان کی سماجی زندگی ارتقا کر کے ایک خاص مقام تک نہ پہنچ جائے جہاں اس کے تمام ضروری اور قدرتی پہلو مثلاً سیاست، جنگ، معاشیات قانون، معاملات وغیرہ پوری طرح سے نمایاں ہوں جونہی کہ انسانی سماج کا ارتقا اس مرحلہ پر پہنچتا ہے اس میں ایک ایسا نبی پیدا ہوتا ہے جو اپنی عملی زندگی کی مثال کے ذریعہ سے انسان کی عملی زندگی کے ان تمام ضروری شعبوں پر خدا کے تصور کا اطلاق کرتا ہے اور اس اطلاق کے ذریعہ سے خدا کے تصور کی صفات کے نظری اور عملی پہلوؤں کو آشکار کرتا ہے۔ وہ گویا پہلا شخص ہوتا ہے جو نوع بشر کو حقیقت کائنات کا ایسا کامل تصور عطا کرتا ہے جو ایک کامل اور صحیح فلسفہ کی بنیاد بن سکتا ہے اور بنتا ہے۔ اس نبی کے ظہور کے بعد نبوت کا اختتام ایک قدرتی بات ہے کیونکہ اس کے بعد انسان کے لیے کوئی مشکل باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنی عملی زندگی کو ہر قسم کی درستی اور ثروت کے اعتبار سے نقطۂ کمال پر پہنچا سکے وہ خاتم الانبیاء جنہوں نے نوع انسانی کو حقیقت کائنات کا کامل تصور عطا کیا ہے جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ فلسفی جس نے علمی حقائق کی ترقیوں کے اس دور میں سب سے پہلے اپنے فلسفہ کی بنیاد نبوت کاملہ کے عطا کیے ہوئے کامل تصورِ حقیقت پر رکھی ہے اقبال ہے اور وہ فلسفہ جو اس دور کے علمی حقائق کو نبوت کے عطا کیے ہوئے کامل تصور حقیقت کی بنیادوں پر نظم کرتا ہے فلسفۂ خودی ہے۔ اقبال نے یہ دیکھ لیا ہے کہ یہی وہ تصور حقیقت ہے جو صحیح ہے اور جو تمام حقائق کائنات کو منظم کر کے ایک وحدت بناتا ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال بار بار کہتا ہے کہ وہ فلسفہ جو نبوت کاملہ کے عطا کیے ہوئے تصور حقیقت پر مبنی نہ ہو بلکہ حقیقت کے کسی ایسے تصور پر مبنی ہو جو کسی فلسفی نے حقائق عالم کی ناتمام معرفت کی بنا پر نبوت کی مدد کے بغیر خود بخود قائم کر لیا ہو بیکار اور غلط ہے اور تمام فلسفے جو آج تک وجود میں آئے ہیں ایسے ہی ہیں۔ صرف خدا کا عشق ہی صحیح فلسفہ کی بنیاد بن سکتا ہے اور اس عشق کا منبع رسول کی اطاعت ہے۔

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو　　یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناریٔ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی
انجامِ خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
دل در سخنِ محمدی بند
اے پورِ علی ز بو علی چند

ہیگل کے فلسفہ پر اقبال نے جو تحقیر آمیز تنقید کی ہے وہ دراصل ان کے نزدیک ہر غیر قرآنی فلسفہ پر صادق آتی ہے۔

حکمتش معقول و با محسوس در خلوت نرفت
گرچہ فکر بکر او پیرایہ پوشد چوں عروس
طائر عقل فلک پرواز او دانی کہ چیست
ماکیاں کز زور مستی خایہ گیرد بے خروس

سچّا تصوّرِ حقیقت فقط خدا کا تصوّر ہے جو زندہ اور حی و قیوم ہے۔ باقی تمام تصورات حقیقت مردہ ہیں اور مردہ کی تصویر کشی بھی جو فلسفہ کی صورت اختیار کرتی ہے مردہ ہی ہوتی ہے اگر آج اسے زندہ سمجھا جا رہا ہو تو یوں سمجھئے کہ وہ نزع کی حالت میں گرفتار ہے اُسے آج نہیں تو کل مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا۔

یا مُردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خُونِ جگر سے

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سرِّ محبت سے بے نصیب رہا
پھرا فضاؤں میں شاہیں اگرچہ کرگس وار
شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

حکیماں مردہ را صورت نگارند
بہ موسےٰ دم عیسےٰ ندارند
دریں حکمت دمِ چیزے نہ دید است
برائے حکمت دیگر تپید است

ظاہر ہے کہ حکمتِ دیگر سے اقبال کی مراد وہ حکمت ہے جو زندہ خدا کو حقیقتِ کائنات مانتی ہو۔ خدا ہی وہ تصورِ حقیقت ہے جو سچے عشق کا منبع ہے اور جس کی فلسفی کو ضرورت ہے۔ اسی عشق سے کائنات کے رازہائے سربستہ منکشف ہوتے ہیں۔ یہی وہ خونِ جگر ہے جس سے فلسفہ لکھا جاتا ہے تو پھر نہ حالتِ نزع میں گرفتار ہوتا ہے اور نہ مرتا ہے اور خدا کا عشق خدا کے رسُول کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا مدلول ہے اور رسُول اُس کی دلیل۔

مے ندانی عشق و مستی از کجاست
ایں شُعاعِ آفتابِ مصطفےٰ ست

عقل تصورِ حقیقت کے تابع رہتی ہے اس کی راہیں اتنی ہی ہیں جتنے کہ حقیقت کے تصورات موجود ہیں۔ لہٰذا اقبال نے عقل کو "عقل ہزار حیلہ" کہا ہے سچے فلسفہ کا دارومدار محض عقل پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ خدا کا سچا عشق عقل کی راہ نمائی کرے۔ سچے عشق کا راستہ فقط ایک ہے اور وہی انسان کی صحیح منزل کی طرف جاتا ہے لیکن عقل کے راستے ہزاروں ہیں۔

نشانِ راہ ز عقلِ ہزار حیلہ مپرس
بیا کہ عشق کمالے زیک فنی دارد!

اسی طرح سے وہ علم شیطانی ہے جو خدا کے سچے عشق سے راہ نمائی نہیں پاتا۔ ایسا علم صحیح فلسفہ کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ لیکن وہ علم جو خدا کی محبّت کے ماتحت وجود میں آئے پاکیزہ اور صحیح ہوتا ہے اور صحیح فلسفے کی بنیاد بن سکتا ہے۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است عقلے بہم رساں کہ ادب خوردہ دل است

بے محبّت علم و حکمت مردۂ عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ
بچشم عشق بگرتا سراغ او بینی جہاں بچشم خرد سیمیا و نیرنگ است
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم
نقطۂ ادوار عالم لا الٰہ منتہائے کار عالم لا الٰہ
لاو الّا احتساب کائنات لاو الّا فتح باب کائنات
حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم نگاہ چاہیے اسرارِ لا الٰہ کے لیے

فلسفی را با سیاستدان بیک میزان منج
چشم آں خورشید کورے دیدۂ آں بے نے
ایں تراشد قول حق را حجتے نا استوار
آں بیارد قول باطل را دلیلے محکمے

ہر علمی حقیقت (حکمت کی بات) صرف ایک فلسفے کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتی ہے اور وہ وہی ہے جو صحیح تصوّرِ حقیقت یعنی خدا کے تصوّر پر مبنی ہو لہٰذا جہاں سے وہ مل جائے اسے تلاش کر کے اس فلسفہ کا جزو بنا دینا چاہیے۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

چونکہ صحیح اور سچّی حکمت جو دنیا کی آخری حکمت ہوگی، خدا کی محبّت یا خدا کے عشق کی بنیاد پر قائم ہوگی اور نوعِ بشر کو متحد کر کے انہیں دائمی امن سے ہمکنار کرے گی۔ اقبال اس بات کی پرزور تحریک کرتا ہے کہ خدا کی محبّت کے نظریہ کو ایک فلسفہ یا حکمت کی شکل دی جائے۔ اس کے بغیر نہ تو خود یہ نظریہ عام قبولیّت حاصل کر سکے گا اور نہ ہی عالم انسانی غلط فلسفوں اور باہمی آویزشوں اور رقابتوں سے نجات پا سکے گا۔ اس قسم کا فلسفہ جب بھی وجود میں آئے گا ایک عالمگیر انقلاب اپنے ساتھ لائے گا اور ایک نئی دنیا پیدا کرے گا۔ عقل جس پر اہلِ مغرب کی زندگی کا دارومدار ہے عشق سے راہ نمائی حاصل کرتی ہے اور خدا کا عشق جو اہلِ مشرق کا امتیاز ہے عقل سے قوّت حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا جب عقل اور عشق ایک دوسرے کے ہمدوش ہو کر ایک دوسرے کے ممد و معاون بن جائیں گے تو پوری دنیا کے اندر ایک انقلاب کارونما ہو جانا ضروری ہوگا۔

غربیاں را زیرکی ساز حیات
شرقیاں را عشق رمز کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس
کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر بود
نقشبند عالم دیگر شود!
خیز و نقش عالم دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ

لیکن ان تمام علمی حقائق کو جنہیں انسان کی جستجوئے صداقت آج تک دریافت کر سکی ہے حقیقت کے صحیح تصور کے ساتھ منسلک کرنے کے بعد بھی تصور حقیقت کی تشریح اپنے کمال کو نہیں پہنچے گی۔ کیونکہ قیامت تک نئے نئے علمی حقائق دریافت ہو ہو کر اس حقیقت کی تشریح کے رشتہ میں منسلک ہوتے رہیں گے اور اس کو زیادہ سے زیادہ واضح اور روشن کرتے رہیں گے اسی لیے اقبال نے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کے دیباچہ میں مشورہ دیا ہے:

"جوں جوں علم ترقی کرتا جائے گا اور فکر کی نئی نئی راہیں کھلتی جائیں گی۔ ان ہی مطالب کی تشریح کے لیے اور تصورات اور غالباً بہتر تصورات میسر آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسان کی علمی ترقیوں کا جائزہ لیتے رہیں اور اپنے تصور حقیقت کی روشنی میں ان پر تنقیدی نگاہ ڈالتے رہیں۔"

اسی خیال کو اقبال نے اس شعر کا جامہ پہنایا ہے۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

لیکن اگر کوئی شخص حقیقت کی معرفت تامہ کا خواہش مند ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عبادت اور ریاضت کے ذریعے سے حقیقت کے حسن و کمال کا ذاتی احساس یا تجربہ یا کشف پیدا کرے ورنہ نہ تو کوئی دانائے راز حقیقت کائنات کی مکمل تشریح کر سکتا ہے اور

نہ ہی کسی فردِ بشر کے لیے ممکن ہے کہ فقط اس تشریح کو سن کر یا پڑھ کر حقیقتِ کائنات کی مکمل معرفت حاصل کر سکے۔

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینہ میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

زباں اگرچہ دلیر است و مدعا شیریں سخن ز عشق چہ گویم جز اینکہ نتواں گفت

رومی نے اس خیال کو بڑے زوردار الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیاں چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں
گرچہ تفسیرِ زباں روشن گر است لیک عشقِ بے زباں روشن تر است
چوں قلم اندر نوشتن مے شتافت چوں بعشق آمد قلم بر خود شگافت
چوں سخن در وصف ایں حالت رسید ہم قلم بشکست و ہم کاغذ درید
عقل در شرحش چو خر در گل بخفت شرحِ عشق و عاشقی ہم عشق گفت
آفتاب آمد دلیلِ آفتاب گر دلیلت باید از وے رو متاب

اقبال ایسا ایک عاشقِ ذات فلسفی اپنے عشق کی حکیمانہ توجیہہ اس لیے کرتا ہے تاکہ اس کا مطالعہ کرنے والا ان عقلی اور علمی قسم کی رکاوٹوں سے نجات پائے جو حقائقِ علمی کی غلط بینی، غلط فہمی اور غلط ترجمانی سے اس کے عشق کی راہ میں پیدا ہو گئی ہوں اور تاکہ وہ ان رکاوٹوں سے نجات پا کر اس کے عشق سے بہرہ اندوز ہو اور پھر جب اس کی محبت کا چراغ اس طرح سے روشن ہو جائے تو وہ بے تحاشا عبادت اور ریاضت کی طرف متوجہ ہو اور پھر عبادت اور ریاضت کے راستے سے ہی اپنے عشق کو یہاں تک ترقی دے کہ اسے کم از کم اس غرض کے لیے خود حکمت کی بھی حاجت نہ رہے پہلے حکمت سے اس کا عشق پیدا ہوا اور پھر اس کے عشق سے حکمت پھوٹتی اور بڑھتی اور پھولتی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کائنات کی ہر علمی حقیقت صرف ایک ہی تصورِ حقیقت کے ساتھ عقلی اور علمی طور پر وابستہ ہے ؟؟

خدا کا تصور ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ خدا ہی کائنات کی سچی حقیقت ہے اس لیے قرآن حکیم نے کائنات کی ہر علمی حقیقت کو ایک آیت یا نشان کہا ہے:

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ اور زمین میں خدا پر یقین رکھنے والوں کے لیے بہت سے نشانات ہیں۔ یعنی چونکہ کائنات کی علمی حقیقتیں صرف خدا کے تصور کے ساتھ جو کائنات کی صحیح اور اصلی حقیقت ہے مطابقت رکھتی ہیں اور کسی باطل تصور حقیقت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں لہٰذا وہ خدا کی خدائی کے نشانات یا دلائل یا شہادتیں ہیں۔

سچا فلسفی یہی کرتا ہے کہ جس قدر حقائق تمام نوع بشر کے دائرۂ علم میں داخل ہو چکے ہوں ان کو معروف اور مقبول علمی اور عقلی معیاروں کے مطابق کائنات کی سچی حقیقت کے ساتھ وابستہ کر کے معلوم کائنات کے ذرہ ذرہ سے کہلواتا ہے کہ کائنات کی سچی حقیقت وہی ہے۔

وفی کل شیٔ لہٗ آیۃ تدل علی انہ واحد

اور اس طریق سے باطل تصوراتِ حقیقت کے حق میں تمام ممکن شہادتوں کو ملیا میٹ کر دیتا ہے اسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ ابھی نوع بشر کے احاطۂ علم میں بہت کم حقائق عالم داخل ہوئے ہیں اس لیے کہ وہ کم ہوں یا زیادہ سب اسی کے تصور حقیقت کی تائید کر رہے ہوتے ہیں اور پھر جو لوگ غلط تصوراتِ حقیقت کے حق میں جھوٹی شہادتیں پیش کر رہے ہوتے ہیں ان کا دار و مدار بھی تو ان ہی حقائق کی غلط ترجمانی پر ہوتا ہے جب ہماری معلوم کائنات کا ہر ذرہ بلند آواز سے اس بات کی شہادت دینے لگ جائے کہ کائنات کی سچی حقیقت خدا ہے تو وہ ساتھ ہی اس بات کی بھی شہادت دے رہا ہوتا ہے کہ خدا کے سوائے تمام تصوراتِ حقیقت باطل اور نامعقول ہیں:

وَمَنْ یَّدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ لَا بُرْھَانَ لَہٗ بِہٖ

اور جو شخص خدا کو چھوڑ کر کسی اور معبود کو پکارے اس کے پاس کوئی دلیل یا شہادت موجود نہیں ہو سکتی۔

اور جب پوری کائنات میں ایک بھی علمی شہادت کسی باطل تصورِ حقیقت کے حق میں باقی نہ رہے تو پھر باطل تصوراتِ حقیقت کا باقی رہنا ناممکن ہو جاتا ہے اور پھر حقیقتِ کائنات کے صحیح

تصور پر قائم کیا ہوا نیا سچا فلسفہ دنیا بھر میں اشاعت پذیر ہوتا ہے اور کسی مزاحمت کے بغیر دنیا کے کناروں تک پھیل جاتا ہے لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ تصورات حقیقت فقط علمی دلچسپی کے نظریات نہیں ہوتے بلکہ افراد اور اقوام کی علمی زندگی کی پوری عمارتیں ان کی بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہیں لہٰذا جب وہ علمی حیثیت سے ختم ہو جائیں تو ان تعمیرات کا ختم ہونا بھی ضروری ہوتا ہے جو ان پر کھڑی ہوں اور جب ساری دنیا ہی باطل تصورات حقیقت پر تعمیر پائے ہوئے ہو تو ایسی حالت میں اس نئے سچے فلسفے کا ظہور پانا اور اشاعت پانا جو دونوں دنیاؤں کی حقیقت کے مرغوب اور مروج تصورات کو باطل ثابت کرنے پر تلا ہوا ہو ساری دنیا کے لیے ایک قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ باطل تصورات حقیقت کے پرستاروں میں سے کون ایسا ہوگا جو کسی فرد واحد کی ذات میں اس قیامت کو ابھرتا ہوا دیکھے اور اسے مٹانے کے درپے نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس قسم کے زلزلہ خیز فلسفے کو پیش کرنا بڑی جرأت کی بات ہے جس کی توقع ہر شخص سے نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ اپنے فکر کی تلوار سے اپنے ہم عصر لوگوں کی دونوں دنیاؤں کو فنا کے گھاٹ اتار دینا چاہتا ہے۔

حکمت و فلسفہ را ہمت مردے باید
تیغ اندیشہ بروئے دو جہاں آختن است

خوگر من نیست چشم ہست و بود
لرزہ بر تن خیزدم از بیم نمود

تاہم یہ قیامت آ کر رہتی ہے اور جب حقیقت کے باطل تصورات مٹ رہے ہوتے ہیں اور ان کے اوپر کی عمارتیں بھی منہدم ہو رہی ہوتی ہیں تو اس عمل کے ساتھ ساتھ اس نئے سچے نظام حکمت کی بنیادوں پر ایک نئی دنیا وجود میں آتی ہے جسے عاشقان جمال ذات مل کر اپنی مرضی کے مطابق تعمیر کرتے ہیں اور ان کی مرضی خدا ہی کی مرضی ہوتی ہے گویا اس سے پہلے ان کے اور خدا کے درمیان یہ مکالمہ ہو چکا ہوتا ہے:

گفتند جہان ما آیا بتو مے سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

اور پھر خدا ان عاشقوں کا حوصلہ بڑھاتا ہے کہ تم جو چاہتے ہو وہی ہوگا اور تمہاری مزاحمت کرنے والے مٹا دیئے جائیں گے۔

قدم بیباک تر نہ در رہ زیست
بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

یہی وجہ ہے کہ اقبال مسلمانوں کو دعوت دیتا ہے کہ صحیح تصور حقیقت پر ایک نئے فلسفے کی تشکیل کریں:

عشق چوں با زیرکی ہمسر بود
نقشبند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیزدہ!

چونکہ اس وقت صحیح تصور حقیقت اپنی پوری صحت اور صفائی کے ساتھ صرف مسلمان قوم ہی کے پاس ہے جو خاتم الانبیاء کی دعوت و تعلیم کی حامل ہے۔ ضروری ہے کہ یہ قوم اپنے نظریہ کی وجہ سے کسی جنگ و جدال کے بغیر روئے زمین پر غالب آئے:

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

جب ایسا ہوگا تو یقیناً یہ تاریخ کا ایک بہت بڑا حادثہ اور عظیم الشان انقلاب ہوگا لیکن یہ حادثہ اور یہ انقلاب ضمیر افلاک میں مخفی ہونے کے باوجود اقبال کی نگاہوں میں آشکار ہے۔

انقلابے کہ نگنجد بضمیر افلاک
بینم و بیچ ندانم کہ چساں مے بینم

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس حادثہ یا انقلاب کے بعد جو حیرت انگیز نئی دنیا وجود میں آئے گی اس وقت ہم میں

سے کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور کسی کو اس کا خیال بھی نہیں نہ مسجد میں نہ مکتب میں اور نہ میخانہ میں:

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و میخانے ہیں مدت سے خموش

عالم تو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

یہ بات حیرت میں ڈالنے والی ہے اور اگر زبان سے کہی جائے تو اسے کون ماننے کا کہ کفر اور شرک اور فسق و فجور اور جنگ و جدال کے ایک ایسے طویل دور کے بعد ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جس میں دنیا کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ تک خدا پرستی اور نیکی اور امن اور صلح اور سلامتی کا دور دورہ ہوگا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

لیکن اہل فرنگ جو اس وقت دنیا میں غالب ہیں اس بات کو نہیں سمجھ سکیں گے کہ آخر کار مسلمان قوم ہی دنیا میں غالب رہے گی سمجھنا تو درکنار وہ تو اس بات کو سننا بھی گوارا نہیں کر سکیں گے۔

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

خود قرآن حکیم کے اندر عالم انسانی کے اس شاندار مستقبل کی پیشگوئی موجود ہے قرآن حکیم میں بڑی تحدی سے اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ انبیاء کا نظریۂ حیات ہی دنیا میں غالب رہے گا اور دوسرے تمام نظریات مٹ کر فنا ہو جائیں گے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ

(خدا نے لکھ دیا ہے کہ بے شک میں اور میرے رسول ہی دنیا میں غالب رہیں گے)

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

(اگر تم سچے مومن بنو گے تو تم ہی دنیا میں غالب رہو گے)

لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ

الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ

(اور بے شک ہمارے پیغمبروں سے ہمارا وعدہ ہو چکا ہے کہ یقیناً وہی مظفر و منصور ہوں گے اور ہمارا لشکر ہی لازماً غالب رہے گا۔)

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝

منکرینِ نبوّت فلسفیوں کو آج تک اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی کائنات کی سچّی حقیقت کا پورا علم نہیں ہوا۔

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم
نگاہ چاہیے اسرارِ لا الٰہ کے لیے

اگرچہ اس حقیقت کے علم کی طرف انہوں نے کچھ نہ کچھ پیش قدمی ضرور کی ہے دراصل فلسفہ اور نبوّت دو مختلف راستوں سے ایک ہی منزل یعنی حقیقتِ عالم کی نقاب کشائی کی منزل کی طرف آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ نبوّت خاتم النبیینؐ کے ظہور سے پہلے اپنی منزل پر نہ پہنچ سکی تاہم اس کی رفتار کا ہر قدم صحیح راستہ پر اٹھتا اور صحیح منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ اس کے برعکس اگرچہ فلسفہ جزوی اور محدود کامیابیاں حاصل کرتا رہا لیکن حقیقتِ کائنات کے صحیح تصوّر سے محروم ہونے کی وجہ سے مجموعی طور پر منزل سے دُور ٹھوکریں کھاتا رہا۔ نبوّتِ کاملہ کی راہ نمائی کے بغیر صحیح قسم کے وجدان سے آغاز کرنا اور لہٰذا صحیح عقلی استدلال کا پانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

ہر دو امیرِ کارواں ہر دو بمنزلے رواں
عقل بحیلہ می کشد عشق بر دکشاں کشاں

نبوّت کی کوشش یہ تھی کہ انسان کو نظامِ عالم کی عقلی ترتیب کی تفصیلات میں لے جانے کی بجائے انسان کو اس کے ضروری حقائق کی واقفیت اس حد تک بہم پہنچا دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں ایسے عمل پر آمادہ ہو جائے جس سے نہ صرف اس کی عملی زندگی درست اور پُرامن اور خوشگوار ہو بلکہ جس سے اس کے اندر وہ صحیح وجدان حقیقت بھی پیدا ہو جائے جو بیک وقت حقیقت کا عشق اور حقیقت کا بنیادی علم ہوتا ہے اور جس کے بغیر وہ نہ تو حقائق کو ٹھیک طرح

سے سمجھ سکتا ہے اور نہ ان کی صحیح عقلی اور علمی ترتیب کو دریافت کر سکتا ہے۔ زندگی کو درست اور پُرامن اور خوشگوار بنانا اور حقائق عالم کی عقلی ترتیب کا دریافت کرنا انسان کی یہ دونوں ضرورتیں ایسی ہیں کہ نبوّت کی روشنی کے بغیر ان کی تکمیل ممکن نہیں لیکن انسان کی پہلی ضرورت فوری تکمیل کا تقاضا کرتی ہے اور دوسری ضرورت اس نوعیت کی ہے کہ اگرچہ اس کی تکمیل کے لیے انسان ہر روز ایک قدم آگے اٹھاتا ہے لیکن اس کی آخری اور پوری تکمیل نوعِ بشر کے علمی ارتقا کے ایک خاص مقام پر ہی ہو سکتی ہے اس سے پہلے نہیں ہو سکتی یہی سبب ہے کہ نبوّت اپنے کمال کو پہنچ کر بھی نظامِ عالم کی عقلی ترتیب کی واقفیت بہم پہنچانے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ صرف اس اعلیٰ قسم کے وجدان کی تربیت کا اہتمام کرتی ہے جو آخر کار اس واقفیت کے حصول کے لیے ضروری ہے اور جس کے بغیر ہمارا عقلی استدلال کامل طور پر درست نہیں ہو سکتا۔ فلسفہ نے ٹھیک سمجھا کہ نظامِ عالم ایک زنجیر کی طرح ہے جس کی ہر کڑی اگلی کڑی کے ساتھ ایک عقلی اور علمی تعلق رکھتی ہے لہٰذا اسے یہی نظر آیا کہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ سلسلۂ عالم کی ساری کڑیوں کو عقل کی مدد سے دریافت کر لے گا لیکن بدقسمتی سے وہ ہر بار اپنے غلط وجدان کو ہی ایک منطقی زنجیر کی شکل دیتا رہا اور لہٰذا ہمیشہ ناکام رہا۔ اگر فلسفہ ذرا جرأت سے قدم اٹھاتا اور نبوّت کاملہ کے تصورِ حقیقت کو جب کہ وہ دنیا کے اندر ظہور پذیر ہو کر اس کی تعلیم دے چکی تھی، اپنا لیتا تو اس کی پریشانیاں ختم ہو جاتیں اور وہ صحیح عقلی استدلال جو صدیوں سے اس کی جستجو کا مرکز رہا تھا اسے حاصل ہو جاتا لیکن جب تک فلسفہ اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتے چلتے نبوّت کے تصورِ حقیقت کے قرب و جوار میں ایک خاص مقام پر نہ پہنچ جاتا یہ دلیرانہ قدم اٹھانا اس کے لیے ممکن نہ تھا خوش قسمتی سے اس بیسویں صدی میں طبیعات، حیاتیات اور نفسیات کے انکشافات کی وجہ سے فلسفہ کو یہ مقام حاصل ہو گیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس نے اقبال کی حکمت میں تعلیم نبوّت کی اصل یعنی توحید یا حقیقتِ کائنات کے صحیح تصور کے ساتھ پیوست ہونے کا دلیرانہ قدم بھی اٹھا لیا ہے۔ اقبال کا فلسفہ خود ہی نبوّت کے عطا کیے ہوئے تصورِ حقیقت کی ایسی تشریح بہم پہنچاتا ہے جس میں آج تک کے دریافت کیے ہوئے تمام علمی حقائق سموئے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس بات کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مستقبل کے علمی حقائق بھی اس کے اندر کیوں سموئے نہ جا سکیں گے۔ فلسفہ کے اس دلیرانہ قدم نے اب راہِ گم کردہ

عقل کو اپنی منزل مقصود پر پہنچا دیا ہے اور اب اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا کہ وہ اس کے بعد بھی بھٹکتی رہے گی۔ اگرچہ اسے عالمگیر انسانی سطح پر سمجھنے کے لیے کچھ وقت لگے گا کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکی ہے اور اس کے آگے اب اس کی کوئی منزل نہیں:

در جہان کیف و کم گردید عقل
پے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ ایں بے چارہ را منزل کجاست
کشتئ ادراک را ساحل کجاست

(جاری ہے)

بقیہ: خدمتِ قرآن کے میدان

تاہم اس میدان میں اردو زبان میں ابھی بہت کم کام ہوا ہے — اور مزید توجہ طلب ہے۔

خدمتِ قرآن کے ان میدانوں میں مستحکم بنیادوں پر قرآن کے لئے خدمات سرانجام دینے کے لئے ہر کوشش مسلمان کے لئے ایک بڑی سعادت ہے

تشریعِ قرآنی کے نفاذ سے بظاہر قرآن کے لئے مختلف خدمات سرانجام دینے میں بھی مزید استحکام کی توقع کی جا سکتی ہے۔

لیکن چاہے جو میدان ہو یا جو مرحلہ، قرآن کی خدمت کرتے ہوئے یا خدمت کی توفیق پاتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اور اس سے خلوصِ نیّت حاصل ہونے کی دعا کرنی چاہیئے۔ یوں تو نیکی کے کسی میدان میں بھی ایسا ہونا ممکن ہے۔ تاہم قرآن کے لئے اور قرآن کے نام سے کوئی کام کرتے ہوئے ضرور کسی نہ کسی مرحلے پر شیطان سے واسطہ پڑنے کے امکانات زیادہ ہیں چاہے وہ اپنا نفس ہو یا کوئی خارجی قوت۔

اور شاید اسی لئے قرآن پڑھنے سے پہلے ہی شیطان سے اس متوقع تصادم سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ کی پناہ طلب کرنے کا حکم ہے۔

عبدالکریم عابد

پرویز صاحب کے افکار کا شجرۂ نسب

(آخری قسط)

عام طور سے جو اعتراض منکرین حدیث کی طرف سے کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ حدیث عہد رسالت کے بعد مرتب ہوئی۔ منکرین حدیث کے بیانات کی یہ خصوصیت تضاد ہے، وہ ایک طرف جہاں یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے عہد میں علم حدیث کا وجود نہیں تھا۔ وہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حدیث کے جمع شدہ ذخیرے جلا دیئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضور اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں حدیثیں لکھی ہوئی نہیں تھی تو پھر حضرت عمرؓ نے آخر کیا چیز جلائی تھی؟ خود منکرین حدیث ہی کے بیان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کم از کم دور نبوتؐ اور عہد ابوبکرؓ میں حدیثیں تحریری طور پر موجود تھیں۔ کیونکہ اگر یہ موجود نہ ہوتیں تو حضرت عمرؓ پھر اسے جلا کس طرح سکتے تھے؟

اگر منکرین حدیث یہ تسلیم کرلیں کہ عہد فاروقیؓ تک احادیث و روایات کا تحریری سلسلہ موجود تھا تو بڑی مشکل آسان ہوجائے گی، اُن کے مزید اطمینان کے لئے چند اور روایتیں اس بارے میں درج ہیں:-

حضرت ابوھریرہؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ میں مجھ سے زیادہ کسی کے پاس حدیثیں محفوظ نہیں تھیں۔ البتہ عبداللہ بن عمرو مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ وہ آنحضرت کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ (صحیح بخاری باب العلم)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت صلعم سے جو سُنتے لکھ لیا کرتے تھے۔ قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت صلعم کبھی غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوشی میں اور تم سب لکھ لیتے ہو۔ عبداللہ بن عمروؓ نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرتؐ سے یہ واقعہ بیان

کیا۔ آپؐ نے دہانِ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو۔ اس سے جو قول نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔ (ابو داؤد جلد ۲ ص[illegible])

ان ۲ دو روایتوں کے علاوہ اور بھی کئی روایتیں اس مضمون کی مل سکتی ہیں۔ ایک صحابی جو آنحضرتؐ کی حدیثیں قلم بند کیا کرتے تھے۔ اُن کے مجموعۂ احادیث کا نام "رویائے صادقہ" تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت انسؓ کے پاس بھی حدیثوں کا لکھا ہوا ہونا ثابت ہے۔

احادیث کی روایتوں کے سلسلہ میں جو احتیاط کی گئی تھی اس کا حال پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ رسولؐ اکرمؐ کے اصل حالات و واقعات اور اقوال و افعال کے محفوظ رہنے میں کوئی شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمرؓ کا طریقہ تھا کہ جب کوئی صحابی روایت حدیث کرتے تو اُن سے وہ چند گواہ بطور ثبوت طلب کرتے۔ اگر یہ معتبر گواہ مل جاتے تو حدیث صحیح تسلیم کر لی جاتی اور ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی۔ اور اگر معتبر گواہ نہ ملتے تو حدیث کو صحیح نہ سمجھا جاتا اور روایت بیان کرنے والے کو دُرّے کی سزا دی جاتی۔ اپنے اس طریقے میں حضرت عمرؓ اس قدر سخت تھے کہ انہوں نے بعض صحابۂ کبار کو بھی سزائیں دی ہیں۔ اگر حضرت عمرؓ حدیث کے مخالف ہوتے تو اس کے بیان کرنے والے کو فوراً ہی سزا دی جاتی۔ اس سے گواہی کا مطالبہ کیوں کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ یہ چاہتے تھے کہ حدیثیں معتبر شہادتوں کی موجودگی میں اختیار کی جائیں۔ اسی لئے ان کے زمانے میں عام لوگوں کے لئے روایت حدیث کی اجازت نہ تھی۔

محدثین نے جو روایتیں بیان کی ہیں، اس روایت کی ہر کڑی یعنی راوی پر باقاعدہ ریسرچ کیا ہے اور اس راوی کا نام، پیشہ، عمر، سلسلۂ نسب، خاندانی حالات، ذاتی مشاغل، تعلیمی قابلیت، قوتِ حافظہ، صحتِ جسمانی، عادات و اطوار، سابقہ اور موجودہ مذہبی عقائد، غرض ہر جزئی سے جزئی تفصیل معلوم کرنے کے بعد اُسے مندرج کر دیا۔ تاکہ بعد میں آنے والے بھی ہر ہر راوی کے بارے میں اعتماد کر لیں۔ چنانچہ اس عظیم ریسرچ کے نتیجہ میں اسماء الرجال کی کتابیں تیار ہوئیں۔ ان کتابوں میں کئی لاکھ آدمیوں سے متعلق تفصیل مع محدثین کی آراء کے لکھی ہوئی ہیں۔ اور اب آپ کو جب کبھی کسی حدیث کے بارے میں شبہ ہو تو اس کے راویوں کی جانچ پڑتال کے لئے پہلے حدیث کی سند دیکھیے۔ اس سند میں جو نام پائے جاتے ہوں ان سے

متعلق محدثین کی ریسرچ اسماء الرجال کی کتابوں میں پڑھ ڈالیئے اور پھر فیصلہ کر لیجئے کہ حدیث کا رواۃ و اسناد کے اعتبار سے کیا درجہ ہے؟

ان محدثین کی دیانت کا یہ حال تھا کہ اگر ان کو کوئی حدیث اپنی دانست میں ذرا سی کمزور یا ضعیف بھی نظر آئی تو انہوں نے اسے لکھ دیا اور تصریح کر دی کہ ہماری اس حدیث کے بارے میں یہ رائے مندرجہ وجوہات کی بنا پر ہے، کوئی اور چاہے تو مزید ریسرچ کرے شاید صحیح ثابت ہو۔ اور امت کے علم میں ایک مزید قول یا فعل رسول کا اضافہ ہو جائے۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تھے تو محض اپنے اختیار تمیزی کی بنا پر اسے رد کر سکتے تھے۔ کوئی ان کو پوچھنے والا نہ تھا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں مگر اپنی ذمہ داری کا خیال محدثین کو بے چین کئے ہوئے تھا۔ اور اسی ذمہ داری کے احساس نے ان کے قلوب کی یہ کیفیت کر دی تھی کہ جب کوئی راوی یا محدث حضور کی روایت بیان کرتا یا لکھتا تو بسا اوقات فرط خشیت الہی سے لرزنے لگتا اور روایت بیان کرنے یا لکھنے سے پہلے بارگاہ الہی میں انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ گڑگڑاتا، نماز پڑھتا اور دعا کرتا کہ یا اللہ تو میری زبان اور قلم سے کوئی ایسی حدیث نکلنے نہ دے جو غیر صحیح ہو۔ ورنہ روز آخرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں کیا منہ دکھاؤں گا اور جب حضور پوچھیں گے کہ تم نے میرے بارے میں ایک غلط بات کیوں بیان کی یا لکھی تو میں کیا جواب دوں گا!

اس خوف نے ان کو اتنا محتاط بنا دیا تھا کہ ایک محدث نے کسی بہت ہی ثقہ راوی کو دیکھا کہ وہ راستہ میں کچھ کھاتے جا رہے تھے، تو انہوں نے ان کی روایت ناقابل اعتبار قرار دی کہ ایسے شخص کا کیا بھروسہ جو اتنا لاابالی ہو کہ معمولی آداب مجلس کی بھی پرواہ نہ کرے۔ ایک اور محدث کا واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے روایت لینے کے لئے دور دراز کا سفر طے کیا اور جب اس کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ کسی برتن میں کچھ دانہ رکھ کر گھوڑے کو دکھا رہے ہیں، گھوڑا دانہ دیکھ کر جب قریب آیا تو انہوں نے اسے پکڑ لیا اور اس کی مشکیں کس دیں۔ یہ ترکیب انہیں اس لئے کرنی پڑی کہ بہت دیر سے گھوڑا ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بعد جب وہ ان محدث کی طرف مخاطب ہوئے اور حدیث بیان

کرنی چاہی تو ان محدث صاحب نے کہہ دیا کہ مجھے تمہاری حدیث منظور نہیں ہے۔ کیونکہ جو شخص گھوڑے کے ساتھ چالبازی اور دھوکا کر سکتا ہے ممکن ہے کہ وہ انسانوں کے ساتھ بھی دھوکا کرے۔ اس غیر معمولی احتیاط کا نتیجہ ظاہر تھا کہ ان کا یہ تکلیف دہ اور طویل سفر بے کار گیا۔

مگر یہ سب غیر معمولی اہتمام صرف اس لئے تھا کہ احادیث زیادہ سے زیادہ صحیح جمع ہو سکیں اور ان میں غلطی کا امکان کم سے کم رہ جائے۔ محدثین کی ان کوششوں کی پشت پر وہ خدائی مشیت اور مرضی بھی موجود تھی جو قرآن میں یہ حکم دیتی ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اللہ نے ہماری ہدایت اور آیت کے پہلے جزو پر عمل کرانے کی خاطر قرآن کو اس کے حفاظ کے توسط سے محفوظ کر دیا ہے اور آیت کے دوسرے جزو یعنی رسولؐ کی اطاعت کیلئے احادیث کو محدثین کے ذریعہ محفوظ و قائم کر دیا ہے۔ اور اب ہم اطیعوا اللہ اور اطیعوا الرسول پر بغیر کسی دقت کے عامل ہو سکتے ہیں۔ اگر قرآن کے ساتھ اللہ تعالےٰ رسولؐ کا نور نہ بھیجتا تو اس نور کی روشنی کے بغیر قرآن کے معنی دیکھنا ممکن نہ رہتا۔ خداوند کریم نے اپنے رسولؐ کو دو چیزیں دی ہیں اور دونوں کا ذکر بالکل الگ الگ ہے۔ ان میں سے پہلی تو "الکتاب" ہے اور دوسری کا نام "الحکمت" ہے۔

جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد سنتِ رسولؐ کی ہمیں ضرورت نہیں۔ وہ ہمیں بتائیں کہ قرآن نے صرف اقیموا الصلوٰۃ کا ذکر کیا ہے، آپ بتائیے کہ صلوٰۃ سے مراد کیا ہے۔ اگر کسی نہ کسی طرح اس کا مطلب ہم نماز سمجھ لیں تو یہ کس طرح پڑھی جائے۔ کب پڑھی جائے اور کتنی پڑھی جائے؟ اس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ملتا۔ اگر احادیث ناقابل اعتبار ہیں تو نماز کی کیا صورت ہوگی۔ قرآن میں فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی نمازوں میں کتنی رکعت پڑھنی چاہئیں۔ اس میں فرض کی تعداد کیا ہے اور سنت کی کیا۔ نیز یہ کہ نماز میں آخر کون سی چیز پڑھی جائے۔ اس کی سب تفصیل تو حدیث اور صرف حدیث ہی میں ملتی ہے۔ یہی حال "اٰتوا الزکوٰۃ" کا ہے۔ زکوٰۃ کب دینی چاہئے۔ آیا ہر روز، ہر سال، یا صرف زندگی میں ایک دفعہ کافی ہے۔ اس پر قرآن روشنی نہیں ڈالتا۔

اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کس حساب سے وصول کی جائے گی اور کن کن چیزوں پہ وصول کی جائے۔ روزوں کے سلسلہ میں بھی صرف "اَیَّامً مَّعْدُوْدَات" کا اشارہ ہے۔ جس کے معنی چند روز کے ہیں۔ اس کی تعداد اور دوسری تفصیلات معلوم کرنے کا واحد ذریعہ حدیث ہی ہے۔ قرآن پاک میں احکام کی تفصیل نہ ہونے کا یہ معنی نہیں ہیں کہ قرآن اپنی تفصیل کے لئے کسی دوسری چیز کا محتاج ہے۔ قرآن محتاج نہیں ہے بلکہ ہم محتاج ہیں اور اللہ تعالےٰ نے ہمارے اس احتیاج کو پورا کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور حضورؐ کی اطاعت کو منصوص قرار دیا۔ اللہ تعالےٰ نے تنہا "الکتاب" نہیں بھیجی بلکہ اس کے ساتھ ایک لانے والے کو بھی بھیجا اور اس سے تین فرائض متعلق فرمائے:-

(۱) آیاتِ قرآنی کی قرأت

(۲) کتاب وحکمت کی تعلیم اور

(۳) اہلِ ایمان کا تزکیہ نفس۔

تو احادیث دراصل قرآن ہی کے حکم اور منشاء کو پورا کرنے والی ہیں اور قرآن پر اضافہ نہیں ہیں بلکہ اس کی قولی وعملی تفسیر وتفصیل ہیں۔ اگر حضورؐ کی "رسالت" "ربوبیتِ الٰہی" پر اضافہ نہیں ہے تو آپؐ کی "سنّت" قرآن پر اضافہ نہیں کہی جا سکتی بلکہ وہ اس کی عملی تفسیر ہے!

بالکل یہی حال اور معاملات کا ہے۔ عبادات، طہارت، معاشرت، اخلاق، سیاست ومعیشت کے بیشتر احکام قرآن مجید میں سرے سے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا ذکر احادیثِ نبویؐ میں ہے، اس لئے حدیث کے بغیر اسلام اور قرآن پر عمل ناممکن ہے۔ منکرینِ حدیث یہ کہتے ہیں کہ ان مسائل میں امّت کا عمل تواتر ہم تسلیم کریں گے یعنی عام مسلمان عبادات کے سلسلہ میں جو اعمال مسلسل اور متواتر انجام دیتے چلے آرہے ہیں اسے دیکھ کر ہم اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ مگر اُمّتِ مسلمہ میں اور بھی بہت سے اعمال مسلسل اور متواتر چلے آرہے ہیں اور ان میں سے بعض غیر شرعی بلکہ مشرکانہ ہیں۔ کیا تواتر کی وجہ سے انہیں تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے قاری اور عامل کو قدم قدم پر حدیث کی ضرورت

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معتزلہ کے گروہ میں سے بعض افراد نے انکارِ حدیث کی بجائے ایک اور مسلک ایجاد کیا۔ یعنی یہ کہ ہم صرف ان حدیثوں کو مانیں گے جو "تواتر" سے ثابت ہوں۔ حضرت امام شافعیؒ نے حدیث کا مطلق انکار کرنے والوں کے ساتھ اس تواتر والے گروہ کی بھی اپنے رسالہ میں خوب خبر لی ہے اور بتایا ہے کہ صحیح حدیث ہر صورت میں قبول کرنی ہوگی۔

حدیث کے بارے میں پرویز صاحب کا رویہ عجیب و غریب ہے۔ کبھی تو وہ احادیث کو "عجمی سازش" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور کبھی منکرِ حدیث ہونے کے الزام کی تردید فرماتے ہیں۔ مگر "طلوعِ اسلام" کے ہر شمارہ میں حدیث کی کتابوں سے چُن چُن کر چند مخصوص حدیثیں جمع کی جاتی ہیں۔ جو اس نوعیت کی ہیں کہ ان کو پڑھ کر ناواقف آدمی یہ خیال کرنے لگے کہ احادیث نعوذ باللہ لغویت کا طومار ہیں۔ حالانکہ اس طرح سے اگر کوئی شخص چاہے تو ایک خاص ذہنیت کے مطابق چھانٹ کر قرآن مجید کی آیتوں کو بھی ایسا ترتیب دے سکتا ہے کہ وہ مضحکہ خیز معلوم ہوں۔ لیکن اس طرح کے سفلہ پن سے قرآن کی عظمت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا۔ اور حدیثوں کو بھی یوں مخصوص طریقے پر معاندانہ طرز سے ترتیب دے کر کوئی شخص رسولؐ کے اقوال و اعمال کو بے وزن ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر پرویز صاحب منکرِ حدیث نہیں ہیں تو پھر یہ سلسلہ کس لئے جاری ہے؟ جہاں تک علماء کا تعلق ہے وہ یہ مانتے ہیں کہ روایت کے اعتبار سے غلط اور موضوع احادیث بھی موجود ہیں مگر حدیث کے اصولِ درایت و روایت کی مدد سے حدیث کا عالم اسے فوراً پہچان جاتا ہے۔ مثلاً ابنِ جوزی نے محدثین کے اصولِ درایت بیان کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے:

"جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصولِ مسلّمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے اس کی نسبت یہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس حدیث کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر۔ اسی طرح سے وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہے، یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے یا جو محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو قطعاً قابلِ اعتبار نہیں ہیں"

(فتح المغیث)

ملا علی قاری نے موضوعات کے خاتمہ میں یہ لکھا ہے :

"جس حدیث میں فضول باتیں ہوں، جو مشاہدہ کے خلاف ہو، جو صریح حدیث کے خلاف ہو اور وہ حدیث جو قرآن کے خلاف ہو، یا وہ جس میں رکیک الفاظ یا مضمون پایا جائے ناقابل اعتبار ہیں۔

روایت اور درایت کے ان تمام اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھنے کے بعد جو احادیث صحیح ثابت ہوں اور ان سے جو سنت مستنبط ہوتی ہو اسے تسلیم کرنے سے انکار کرنا انکار حدیث ہے۔ اگر اس سنت کو پرویز صاحب دین ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہیں تو وہ بلاشبہ منکر حدیث ہیں۔ اس بارے میں نہ انہیں خود مبتلائے غلط فہمی رہنا چاہیئے اور نہ دوسروں ہی کو دھوکا دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ انکار حدیث کا مسلک شوق سے اختیار کریں لیکن یہ جان لیں کہ اب سے پہلے معتزلہ نے حدیث کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے لاکھ جتن کر ڈالے اور باوجود یہ وہ پرویز صاحب اور ان کی طرح کے لوگوں کے مقابلہ میں سینکڑوں گنا زیادہ علم رکھتے تھے، مگر انہیں اپنے مقصد میں تندہی ناکامی ہوئی۔ حدیث کے سلسلہ میں معتزلیوں کا یہ طرز فکر علمائے حق کے دلائل و استدلال کی تاب کسی وقت بھی نہیں لا سکا۔ اور آخر کار اس نے اپنے آپ کو ایک اور دوسری تحریک کی صورت دی۔ یہ تحریک اسلامی تاریخ میں فرقہ باطنیہ کے نام سے مشہور ہے۔

باطنیوں کے مسلک کی بنیاد معتزلہ کی فلسفہ پرستی، سائنس پرستی اور عقل پرستی پر استوار کی گئی۔ اور چونکہ اس کے ایرانی علمبردار پکے وطن پرست بھی تھے، اس لئے انہوں نے عرب کے غلبہ و تفوق کے خلاف اپنی وطنیت کو سربلند کرنے کے لئے عجیب و غریب عقائد تراش کر ایک فرقہ کی داغ بیل ڈالی دی۔

باطنیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر زمانے کے لئے ایک شریعت کا اصول اور ہر زمانہ یا ہر دور کے لئے مذہب کا ایک بندھا ٹکا نظام نہیں چل سکتا۔ اس لئے ایک دین کے باوجود بہت سی شریعتیں آتی رہی ہیں اور آئندہ بھی " صد جہاں باقی است در قرآں ہنوز " کے " طابق الگ الگ زمانے کے لئے جدا جدا شریعتیں بنائی جائیں گی۔ کیونکہ اصل میں شریعت

تو صرف مذہب کا لباس ہے۔ جو انسان کی ذہنی ترقی اور زمانہ کے ماحول اور موسمی حالات کی بنا پر ہمیشہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا ؎

دم بدم گر خود لباس بدل مرد صاحب لباس را چہ خلل

کے نظریہ کے مطابق باطنیہ صرف اصل دین حقائق اور مذہب کے بنیادی اصولوں ہی کو دائمی و ابدی شے سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کا اوپری ڈھانچہ، رنگ روپ، رسم و رواج کبھی اس حیثیت سے ہمارے پیش نظر نہیں رہنے چاہئیں کہ یہ اصل دین کی طرح ان مٹ ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ قرآن جس سوسائٹی میں نازل ہوا وہاں اس نے اپنے زمانے کے شعور، ذہن کی سطح، تاریخی روایات، معاشی حالات اور تہذیبی پس منظر کے مطابق ایک خاص شکل اور ایک خاص شریعت اختیار کی۔ اس شکل کو دائمی اور ابدی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت، منہاج اور مناسک کے قوانین اولی الامر کی مرضی پر منحصر ہیں۔ وہ جس قانون کو چاہے مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر منسوخ کر دے اور جسے چاہے باقی رکھے۔ باطنیہ کہتے ہیں کہ احادیث کے بیشتر قوانین اور اصول رسول اللہ نے بحیثیت اولی الامر یا صدر ریاست کے وضع کیے تھے اور وہ وحی نہیں ہیں۔ ان قوانین احادیث کی اہمیت وقتی، مقامی اور عارضی تھی۔ کیونکہ بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے اُن کی پابندی کو کہیں بھی ناگزیر نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے اس باب میں رسولؐ کی سنت کی بجائے اولی الامر کی مرضی اور اس کی بصیرت کے مطابق کیے ہوئے فیصلے سند اور حکم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شریعت اسلام کے سلسلہ میں پرویز صاحب کا مسلک بھی یہی ہے کیونکہ وہ بھی احادیث نبوی کو اس بنا پر کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ حضورؐ نے یہ فیصلے بحیثیت رسولؐ کے نہیں کئے تھے اور یہ اقوال و اعمال حضورؐ کی پیغمبرانہ حیثیت میں جاری نہ ہوئے تھے، بلکہ یہ صدر ریاست اور اولی الامر کے احکامات و اعمال ہیں اور رسول یا پیغمبر کی اطاعت کے ضمن میں اس کی حیثیت اولی الامر کا اتباع ضروری نہیں ہے۔ لیکن عام مسلمان باطنیوں اور پرویز صاحب کے خلاف یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضورؐ اکرمؐ نے جس دین کی تبلیغ فرمائی اُس کی شریعت کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔

دراصل زمانہ چاہے کتنی ہی کروٹیں کیوں نہ بدلے، اس کے مزاج اور طبیعت میں کوئی دنیاوی فرق پیدا نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر زمانہ جُدا جُدا ایک اکائی اور الگ الگ وجود نہیں ہے بلکہ یہ ایک وحدت ہے جسے کہیں بھی تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اور زمانہ کی اسی یکسانیت کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت بھی غیر متغیر ہے، یہ فطرت ابتدائے آدمیت سے ایک ہی رہی ہے اور آخر تک ایک ہی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی رسوم یا قوانین جو شاید حضرت آدمؑ کے زمانے اور انسانیت کے ابتدائی دور میں وضع کئے گئے تھے۔ اب تک قائم ہیں۔ آپ کسی قوم یا علاقے کی رسومات، روایات، عادات، اطوار، طور طریق کو دیکھ لیجئے تو یہ معلوم ہوگا کہ ان کی بیشتر رسومات اور بہت سے طور طریقے نہ صرف پرانے بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں برس سے جاری وساری ہیں۔

پھر جب صورت یہ ہے کہ انسانوں کی متعین کردہ معمولی رسومات سینکڑوں اور ہزاروں برس سے قائم و دائم ہیں تو آخر محمد رسول اللہ کی شریعت کو کیا ہوگیا کہ وہ ہزار برس ہی میں منسوخ ہو کر رہ جائے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے بیشتر قوانین ابتدا ہی سے عالمگیر حیثیت رکھتے تھے اور اسی لئے وہ جزوِ شریعت ہیں۔

پرویز صاحب میں اور باطنیوں کے اصول اساسی میں یہ نظریہ بھی مشترک ہے کہ تمام معاملات میں "اولی الامر" کی رائے گناہ اور عیب سے پاک سمجھی جائے، اور اس کے سب احکام لوگ بلا چون وچرا مان لیں۔

"طلوعِ اسلام" کے صفحات میں وقتاً فوقتاً بعض ایسے مضامین بھی نکلتے رہتے ہیں کہ اس میں اولی الامر کے اختیارات کے بارے میں اسی تصور کی نمائندگی ملتی ہے جو زمانہ قدیم کے باطنیوں یا زمانہ حال کے فاشسٹوں کے درمیان موجود تھا۔ ملّتِ اسلامیہ میں اختلافِ فکر ونظر کے وجود کو پرویز صاحب بھی صحیح نہیں سمجھتے ہیں کہ ساری امّت کو متحد کرنے کے لئے ہر طرح کی مذہبی وسیاسی جماعتوں کو غیر قانونی قرار دے کر صدرِ ریاست کو غیر محدود اختیارات دینے چاہئیں۔ باطنیہ بھی اپنے حدود میں کسی اور گروہ کو سیاسی یا مذہبی طور پر

منظم دیکھنا نہیں چاہتے اور ان کا امیر بھی بالکل ہٹلر کے انداز میں مطلق العنان اور خدائی اختیارات کا حامل ہے۔

باطنیوں نے اولی الامر کے انہی اختیارات کے جواز کے لیے امامت من جانب اللہ، حلول، وغیرہ کے عقائد وضع کئے ہیں۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ امامت چونکہ منجانب خدا ہوتی ہے اور امام کو خدا تعالیٰ خاص طور پر منتخب کرتا ہے۔ اس لئے وہ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں مطلق فضیلت کا مالک ہے اور اس فضیلت کا نتیجہ معصوم عن الخطا ہونا ہے۔ دوسرے معنوں میں جماعت کا اولی الامر گویا ظلِ الٰہی ہے۔ کیونکہ اس کی مرضی میں ہمیں خدا کی مرضی نظر آتی ہے۔

اپنے اس نقطۂ نظر کی تقویت کے لئے وہ حلول یا اوتار کے عقیدہ کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صفاتِ خداوندی صدر ریاست کی شخصیت میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص یہ رائے رکھتا ہو وہ تو اولی الامر کی مطلق اطاعت کا قائل ہی ہوگا۔ کیونکہ اس کے پاس اپنی رائے کی تائید میں صحیح یا غلط کچھ دلائل اور ایک خاص فلسفیانہ پس منظر موجود ہے۔ مگر پرویز صاحب جب امیر کی اطاعتِ مطلقہ کو ضروری بتاتے ہیں تو اپنے مسلک کی تائید میں صحیح یا غلط کسی قسم کی بھی وہ بنیاد نہیں بتاتے کہ ہم کیوں اس نظریہ کو معقول سمجھیں۔ آخر وہ دلیل کون سی ہے جس کی رُو سے اولی الامر یا صدر ریاست کو آپ اتنے غیر محدود اختیارات کا مالک قرار دیتے ہیں کہ اگر وہ چاہے تو شریعتِ محمدیہ کو منسوخ کر دے یا اگر وہ مناسب سمجھے تو اکثریت کے مقابلہ میں صرف اپنی ذاتی رائے کو دوٹوک فیصلہ کی حیثیت دے دے اور جس کی یہ شان ہو کہ اس کے مقابلہ میں کوئی اختلاف کرنے والا گروہ باقی نہ رہ سکے۔

اگر اولی الامر خدا کا خاص منتخب فرد نہیں ہے اور ہماری طرح ہی طرح کا انسان ہے تو پھر بتایئے کہ اُسے اپنی ذاتی رائے اکثریت پر مسلط کرنے کا کیا حق ہے۔ پھر جمہور کی مرضی یا اکثریت کے فیصلے سے چُنے جانے والا اولی الامر انتہائی محدود، کم سے کم اور صرف ناگزیر اختیارات اپنے لئے طلب کر کے حکومت کرتا ہے۔ کیونکہ از روئے کتاب و سنّت انسان

کی حاکمانہ مطلق العنانی ہی دنیا کی تمام خرابیوں اور فساد کی جڑ ہے۔ اس لئے اسلام چاہتا ہے کہ غالب جماعت یا فرد کے ہاتھوں میں سیاسی حاکمیت مذہبی اقتدار اور معاشی تسلط انتہائی کم سے کم ہو۔ اسلام کسی ایسے نظام حکومت کی حمایت نہیں کرتا جہاں عوام کی انفرادی آزادی سلب ہو سکے اور جہاں پر ریاست یا صدر حکومت "الٰہ" بن جائے۔ ہیگل، مارکس اور باطنیوں کے کلیت پسندانہ نظام ہائے حکومت اسلامی نقطہ نظر سے بالکل غلط ہیں۔ اس لئے اسلامی حکومت کے صدر غیر محدود اور انتہائی اختیارات کے مالک کبھی نہیں رہے

پرویز صاحب اور باطنیہ پہلے تو رسول اللہ کو منصب رسالت سے ہٹا کر مقام اولی الامر تک لے آنے کی جسارت بے جا کرتے ہیں اور پھر اولی الامر کو منصب رسالت پیر د کرتے ہیں تاکہ وہ غیر محدود اختیارات کا مالک اور ایک نیا شریعت ساز بن سکے۔ یہ فکر بالاتفاق مردود ہے اور اسلامی حکومت میں اولی الامر کے اختیارات مطلق اور آزاد نہیں ہیں۔ بلاشبہ نص قرآنی یا سنت رسول کے خلاف اکثریت یا شوریٰ اگر کوئی فیصلہ کر رہی ہو تو امیر کو اسے مسترد کرنے کا حق حاصل ہے۔ جیسا کہ ابوبکرؓ صدیق نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں تنہا اپنی رائے کو درست سمجھا اور اسے نافذ کیا مگر اکثریت کی رائے کتاب اللہ اور سنت رسول کے خلاف نہ ہو اور اختلاف سارا اولی الامر کی ذاتی رائے سے ہو تو شوریٰ اور اکثریت کے فیصلہ کا "اولوالامر" کو لحاظ کرنا ہوگا۔

بعض انتظامی معاملات میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی اکثریت کے فیصلہ کو درست قرار دیا ہے، جب ذات رسالت مآب کا شوریٰ کے معاملہ میں یہ حال ہو تو دنیا میں کسی دوسرے کو چاہے وہ اولی الامر ہو یا صدر مملکت یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ وہ ان باتوں کو یک قلم نافذ و جاری کر دے جو مجلس شوریٰ کے نزدیک قطعاً غلط ہوں!

باطنیہ و معتزلہ کے افکار کی یہ جھلک پرویز صاحب کے خیالات میں اس لئے نظر آتی ہے کہ وہ جن لوگوں سے متاثر ہیں۔ انہوں نے اپنی ذہنی رجحان اور تفکر کو ترقی دینے میں مندرجہ بالا فرقوں کے نظریات سے بڑی مدد لی تھی۔ مثلاً سرسید کو دیکھئے وہ مغربی طرز فکر

سے اثر پذیر ہو کر ایک نئے مکتب خیال کی بنیاد رکھتے ہیں۔ سر سید نے اگر معتزلہ کے خیالات کا مطالعہ نہ کیا ہوتا تو یقیناً اُن کی وہ مشہور تفسیر منظر عام پر نہیں آسکتی تھی جس نے مذہبی طبقہ کو برافروختہ کر دیا تھا۔ سر سید کی اس تفسیر قرآن میں فرشتوں کا انکار، عذاب قبر کا انکار، حشر و نشر اور معاد و آخرت کی نئی تشریح، روایات و احادیث کے خلاف عدم اعتماد، علماء، فقہاء اور محدثین پر تہمت تراشی، غرض وہ سب کچھ ہے جسے ہم معتزلہ کے افکار کا نچوڑ کہہ سکتے ہیں۔

اسے از سر نو پیش کرنے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی تھی کہ انہوں نے عیسائی پادریوں کی وہ بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں جن میں اسلام، قرآن اور سنت رسولؐ کو خلاف عقل اور خلاف سائنس بتایا گیا تھا۔ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے ساتھ ہی یورپ سے پادریوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا اور یہ پادری سڑکوں، چوراہوں اور راستوں پر مجمع لگا کر ہندوستان کے مذہب کو نیچر، عقل اور سائنس کے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

عیسائی پادریوں کی یہ تبلیغی جد و جہد ہندوستانیوں پر اثر انداز ہوئی اور سب سے پہلے ہندوؤں نے اپنے مذہب کو ترمیم و تنسیخ کے ذریعے نیچر، عقل اور سائنس کے ذریعے ثابت کرنے کے لئے مختلف تحریکات کا آغاز کیا اور ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی کچھ لوگوں کو یہ شوق چرایا۔ ان لوگوں میں مرزا غلام احمد قادیانی اور سر سید دو بڑی مشہور ہستیاں ہیں ــــ!

مرزا غلام احمد قادیانی کے پادریوں کے ساتھ بڑے مناظرے رہے مگر ان مناظروں کی بدولت ان کا ذہن پادریوں سے شکست کھا گیا اور انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ مسیح، مہدی، دجّال وغیرہ کے متعلق جو احادیث پائی جاتی ہیں انہیں عقل اور نیچر کے مطابق کیا جائے اور نبوت، وحی وغیرہ کے مسائل پر بھی سائنسی نقطۂ نظر سے نظر ثانی ہو۔ لیکن اس طرح پر تجدید اسلام کی کوشش بالآخر ایک نئی نبوت کے قیام کا ذریعہ بن گئی اور اسلام کو نیچر کے مطابق بنانے کی یہ مہم ملت اسلامیہ سے بالکل الگ ایک جداگانہ فرقہ کی صورت اختیار کر کے ختم ہو گئی۔ سر سید نے مرزا غلام احمد قادیانی کے مقابلہ میں زیادہ عقلمندی سے کام لیا۔ انہوں نے اس کی کوشش نہیں کی کہ وہ کسی مستقل فرقہ کے بانی بن جائیں۔ اُن کے اندر یہ داعیہ موجود نہ تھا۔ ہاں اس

کو نیچر، سائنس اور عقل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بلکہ مہم ان کے پیش نظر رہی اور اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اس منزل میں انہوں نے بڑی بڑی ٹھوکریں کھائیں! مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ انہیں واقعی خلوص بھی تھا۔ اور عیسائی پادریوں کے اعتراضات کے جواب میں اُن کے جذبۂ ایمانی کو موافقت کی یہی ترکیب کارگر نظر آئی کہ جن مسائل کی وجہ سے یہ اعتراضات ہو رہے تھے ان مسائل کے بارے میں معتزلہ کی رائے نقل کر کے مشتہر کر دی جائے اور ان کی یہ کوشش جدید نوجوانوں کے گروہ پر کافی اثر انداز ہوئی۔

سر سیّد بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ان کے بھی حامی ہو گئے تھے کہ مسلمان اپنے کلچر اور تمدن کو ترک کر کے یورپین تہذیب کو اختیار کر لیں۔ تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں کہ ترکوں نے اپنی قدیم معاشرت و وضع قطع ترک دی ہے۔ اب وہ میز کرسیوں پر بیٹھ کر چھری چمچے سے کھانا کھاتے ہیں۔ داڑھی منڈواتے ہیں اور کوٹ پتلون پہننے لگے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کو بھی ترکوں کی تقلید میں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ اپنے اس خیال کی وجہ سے انہیں علماء سے بڑی جنگ کرنی پڑی۔ مولویوں کا کہنا تھا کہ ہر قدم میں کچھ رسومات اور روایات ایک خاص تسلسل کے ساتھ جاری و ساری ہوتی ہیں۔ یہ تسلسل توڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم قوم کو تباہ کر دیں۔ ہر قوم کے لیئے اس کا ماضی مستقبل و حال کی تعمیر کے لئے ایک بنیاد ہے اور ماضی سے اپنا تعلق ختم کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم معلق ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر بہت ساری رسومات، روایات اور طور طریق ملّی زندگی کے لیئے ایک امتیازی نشان اور " Symbol " ہوتے ہیں۔ ان روایات، رسومات اور طور طریق میں ہمارے بنیادی افکار پنہاں ہیں۔ انہیں مٹانے کے معنی خود اپنے آپ کو مٹانے کے ہیں۔ مولویوں کی یہ بات سر سیّد کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ محض ہمارے قدامت پسند طبقہ اور مولویوں کی جہالت ہے مگر حقیقتاً ان لوگوں کے علاوہ اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر نذیر احمد اور دوسرے انگریزی تعلیم یافتہ افراد بھی سر سیّد کے مخالف تھے۔ کیونکہ کسی بھی قوم کا ذہین اور خوددار طبقہ اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کو یوں آسانی سے خودکشی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس لئے سر سیّد کی تحریک بحیثیت مجموعی ناکام ہو گئی۔ مگر چونکہ برطانوی راج کی مصلحتیں اس تحریک کے ساتھ

وابستہ تھیں اس لیے آزادی ہند تک یہ مسلک کسی نہ کسی طرح زندہ رہا۔ اور اب سمٹ سمٹا کر ہماری سوسائٹی کے ایک خاص طبقے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے مگر عوام پرانی تہذیب پرانے کلچر کو ختم کرنا نہیں بلکہ اُسے ترقی دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدیم شریعت کی تجدید کے مطالبے سُنتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ مطالبے اُن لوگوں پہ گراں ہی گزریں گے جو آج بھی سرسید کے طرزِ فکر کو اپنائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "طلوعِ اسلام" مسلمانوں کی اس کوشش کو پسند نہیں کرتا ہے جو وہ اسلامی دستور کے سلسلہ میں کر رہے ہیں۔

مگر ہم کو یہ حقیقت بہرحال اب سمجھ لینی چاہیئے کہ ایک مسلمان ہی کیا دنیا کی کسی قوم کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی قدیم شریعت اور قدیم فقہ کا گلا گھونٹ کر آگے بڑھ سکے، بدقسمتی سے ہمارے نوجوانوں کی ایک جماعت ترقی کا مطلب یہ سمجھنے لگی ہے کہ ایک قوم اپنے سینکڑوں برس کی تاریخ و تہذیب کو یک قلم منسوخ قرار دے اور مذہبی، معاشرتی، تاریخی و جغرافیائی زندگی سے جو رشتہ ہمارا قدیم نظام زندگی رکھتا ہے، اسے سمجھے بغیر پُرانے نظام کے چہرے پہ خطِ نسخ پھیر دیا جائے۔ یہ ذہنیت جس کی ابتدا سرسید نے کی تھی عمرانیات کی تاریخ سے ناواقفیت کا سبب اور عقلی جدت طرازیوں کا پیدا کردہ کھلونا ہے۔ اور اس سے ہمارا مغربی تعلیم یافتہ طبقہ بہت زمانے سے دل بہلا رہا ہے۔

کسی بھی شے کو ترقی دینے کے معنی اس کے وجود کو قائم رکھ کر مزید نکھار پیدا کرنے کے ہیں، نہ یہ کہ سرے سے اس کا وجود ہی ملیا میٹ کر دیا جائے۔

پس کسی تہذیب کی ترقی کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اس تہذیب کی خصوصیات باقی رہیں اور اس کے حُسن میں کچھ اضافہ ہو جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم اپنی تہذیب پر تبرا بھیجنے لگیں اور اس کے حریف بن جائیں۔ ہر قوم کی ایک مخصوص طبیعت اور فطرت ہے جو تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی مظاہر میں گھل مل کر رفتہ رفتہ پرورش پاتی رہتی ہے اور برہا برس کے تاریخی، جغرافیائی و نفسیاتی عوامل کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے جو کسی ایک معاشرے کی تخلیق کر کے اس کو اکثر پہلوؤں اور اکثر اعتبارات سے ایک قطعی شکل دیتا ہے، اس

معاشرے اور تہذیب کا خاتمہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی قومی فطرت و جبلت کو قتل کر دیں اور صدہا برس کے عوامل کو نظر انداز و فراموش کر کے تہذیبی اعتبار سے دیوالیہ اور برباد ہو جائیں۔ اگر یہ حقیقت سرسید سمجھ لیتے تو پھر نہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے جواز کا فتویٰ دیتے اور نہ ہندوستانی مسلمانوں کو چھری چمچوں کانٹوں اور میز کرسیوں کے استعمال کا فلسفہ سکھاتے اس کے مقابلے میں ہمارے پاس کے مولوی کی آپ چاہے کتنی ہی برائی کیوں نہ کریں۔ مگر اس کی یہ حقیقت پسندی تو واقعی قابلِ داد ہے کہ اس نے ترقی کی محض خالی اڑان اور چھلانگ کی خاطر یہ بات کبھی نہیں بھولی کہ قومی تہذیب اور قومی تمدن کے ساتھ اس کا رشتہ ایسا نہیں ہے کہ جب وہ چاہے اسے طلاق دے دے۔ اپنی اسی خوبی کی بدولت "مولوی" مغرب زدہ طبقہ میں ملامت کا مستحق سمجھا گیا تھا۔

سرسید کے بعد مولوی کو گالیاں دینے کی تحریک ایک عرصہ تک رُکی رہی اور اس کا دوسرا دور علامہ مشرقی کی صورت میں جاری ہوا۔ علامہ مشرقی اصل میں سرسید کا نیا روپ تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی تحریک سرسید سے زیادہ منظم، اُن کے افکار سرسید سے زیادہ مدلل بھی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ صاحب کی معرکتہ الآرا کتاب "تذکرہ" کی داد نہ دینا بڑا ظلم ہے، تذکرہ کا ایک ایک لفظ مشرقی صاحب کی محنت اور مطالعہ کی وسعت کا ثبوت دیتا ہے، اس کتاب میں علماء دین کے طرزِ فکر کو انتہائی ہوشیاری اور تدبیر کے ساتھ رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"تذکرہ" کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات ہیں:

(۱) ہمارے لئے صرف قرآن کافی ہے اور قرآن کو سمجھنے میں اسلامی تاریخ، روایات، حدیث، فقہ اور لغت کی مدد ہرگز نہ لی جائے۔ کیونکہ قرآن اپنا شارح آپ ہے اور تاریخ، روایات، حدیث، فقہ و لغت کی تشکیل کرنے والے سب عجمی سازش کا شکار رہے ہیں، اس لئے ان کی مدد سے قرآن کو سمجھنا گمراہی ہوگی۔

(۲) مطالعۂ قرآن سے پہلے ہمیں اس کی اصطلاحوں کی تعریف (Definations) طے کر لینی چاہئے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاحات قرآن میں جہاں جہاں

استعمال میں ہیں انہیں دیکھا جائے اور پھر اس کا ایک ایک مطلب تعین کر دیا جائے اور یہ مطلب یا معنی قطعی سمجھ لئے جائیں۔

(۳) قرآن اور موجودہ یورپی سائنس کے اصولوں میں اتفاق پیدا کیا جائے کہ قرآن و سائنس "من دیگرم تو دیگری" کو خیرباد کہہ کر "من تو شدم تو من شدی" ہو کر رہ جائیں۔

(۴) حضور اکرمؐ نے قرآن کو نافذ کرنے کے لئے چند مخصوص اوزار عمل وضع کئے تھے۔ ان اوزار عمل کو چھوڑ کر نئے طریقے اختیار کئے جائیں کیونکہ از روئے قانون صرف دین کے بنیادی عقائد دائمی و ابدی ہیں۔ نہ کہ ان کا اوپری لباس مطمح نظر ہے۔

(۵) پوری ملت کی تنظیم جدید اس اصول پر ہو کہ ان کا اولی الامر غیر محدود اختیارات کے ساتھ ملت پر حکمرانی کرے اور یہ حکمران ایک ایسی ریاست کو بروئے کار لائے گا جو معاشرہ اور افراد کی زندگیوں کے تمام شعبوں پر کلیتاً قابض و متصرف رہے گی۔

علامہ مشرقی کے یہ اصول ہائے پنجگانہ جب علماء مفکرین کے درمیان زیر بحث آئے تو لوگوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ تذکرہ بھی باوجود یکہ بظاہر زیادہ مدلل اور معقول نظر آتا ہے مگر اس میں بھی سرسید کی پرانی ذہنیت کارفرما ہے اور علامہ مشرقی کے اصولوں کو مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسلامی اساس ہی کو کھود کر پھینک دیں۔!

علماء کا استدلال یہ تھا کہ اگر مسلمان مؤرخین، راویوں، محدثین، فقہاء اور اہل لغت حضرات کو عجمی سازش کا نمائندہ سمجھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہماری قوم ابتدا ہی سے غداروں اور احمقوں پر مشتمل رہی ہے۔ کیونکہ جس قوم کے محدثین کرام، فقہائے عظام، مؤرخین اور اہل لغت حضرات سب کے سب سازشی ہوں یا سازشیوں کے آلہ کار ہوں، اس قوم کے قرآن کا بھی کیا بھروسہ؟ کہ وہ بھی کہیں "عجمی سازش" کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ دوسرے معنوں میں یہ طریق فکر دانستہ یا نادانستہ ملت اسلامیہ کی تاریخی اہمیت اور عظمت کا انکار کر کے اسے سازشیوں اور سازشی جماعت کا نام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے کوئی بھی عقلمند آدمی صحیح نہیں تسلیم کرے گا۔ بلاشبہ یہ تو ممکن ہے کہ ہم میں

انفرادی طور پر کچھ لوگ غدار پیدا ہوئے ہوں ۔ یا غیر شعوری طور پر بعض بزرگ بیرونی طاقتوں کے مفاد کا آلۂ کار بن گئے ہوں ۔ مگر یہ سمجھنا کہ پوری کی ایک قوم کی قوم مع اپنے تمام بزرگوں اور اہلِ علم کے کسی سازش کی علمبردار یا آلۂ کار رہی ہو کس قدر غلط ہے ۔

علماء کو علامہ مشرقی کی اس حرکت پر بھی اعتراض تھا کہ انہوں نے قرآن کے بارے میں یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ اس میں ایک ہی لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے ۔ دراصل یہ صرف قرآن ہی نہیں بلکہ ہر زبان اور خاص طور سے عربی کی ایک خصوصیت ہے کہ روزمرہ بولی اور لکھی جانے والی زبان میں ہر لفظ سیاق و سباق کے اعتبار سے مختلف معانی پیدا کرتا ہے ۔ اس حقیقت کو بھول کر قرآنی الفاظ کے ہر جگہ ایک ہی معنی متعین کرنا غلط ہے ۔ قرآن سائنس یا کسی مخصوص علم و فن کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں ایک لفظ با قاعدہ ایسی اصطلاح ہو کہ فلسفہ کی طرح جس کی تعریف طے کر لی جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وحی ، جنت وغیرہ کے الفاظ قرآن میں مختلف جگہ پر مختلف معانی میں آئے ہیں ۔ کہیں یہ لفظ " جنت " باغ کے لئے استعمال ہوا ہے اور کہیں مادی یا معاشی خوشحالی کے معنوں میں بھی مگر جب جنت کا ذکر قرآن آخرت کے ضمن میں کرتا ہے ، وہاں یہ قیامت کے بعد کی بہشت ہی مراد ہے ۔ اسی طرح نزولِ وحی شہد کی مکھی پر بھی قرآن سے ثابت ہے اور حضور اکرم پر بھی لیکن ان دونوں مقامات میں وحی کا لفظ بالکل الگ الگ معنی رکھتا ہے ۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص مومنین کی جنت کو اس معنی میں لے جس معنی میں " فاخرجنھم من جنت وعیون و کنوز و مقام کریم " پھر نکال باہر کیا ہم نے ان کو جنت اور چشموں سے اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے " تو یہ ایک فاش غلطی اور غلط ترجمانی ہے ۔ اسی طرح اگر کوئی شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کو وہی شے سمجھتا ہے جو مکھی کو حاصل ہے تو یہ گمراہ ذہنیت ہوگی ۔ کیونکہ الفاظ گو سب جگہ ایک ہی استعمال ہوئے ہیں مگر سیاق و سباق کے اعتبار سے معانی مختلف ہیں ۔ اس نکتہ کو فراموش کر دینے کا نتیجہ تھا کہ علامہ مشرقی نے قرآنی الفاظ کی نئی لغت تیار کی ۔ اس لغت میں جنت کے معنی مادی و معاشی خوشحالی ، جہنم کا مطلب مادی و معاشی تباہی

تقویٰ کے معنی اتحاد و ہم آہنگی، صالح کے معنی طاقت ور اور کافر کا مطلب مغلوب و کمزور، آخرت کے معنی انسانی مستقبل کے ہیں۔ اس دوسرے الفاظ قرآنی کے عجیب و غریب معنی و مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ اور قرآن پر جس شخص کی نگاہ ہو وہ ان معانی و مطالب کو کبھی درست نہیں جان سکتا۔

پھر قرآن و سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں انہوں نے قرآنی آیات سے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء، نیوٹن کے نظریات اور دوسرے یورپی مفکرین اور سائنس دانوں کے تراشے ہوئے نتائج ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک نظریۂ ارتقار کا تعلق ہے اس سے بیشتر ابن مسکویہ اور فارابی نے بھی قریب قریب یہی نظریۂ ارتقار پیش کیا تھا۔

انسان کی حیاتیاتی ارتقار کے اس نظریہ کی قرآن سے تصدیق یا تکذیب ناممکن ہے کیونکہ حیاتیات قرآن کا موضوع بحث نہیں ہیں۔ پھر ڈارون کے معاملے کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کے نظریہ کے سائنسی نتائج کے ساتھ ذاتی قیاسات اور نظریات کی آمیزش بھی کر دی گئی ہے۔ اور پھر ارتقار کے بارے میں ڈارون کا مطالعہ بھی نامکمل اور یک رُخی رہا ہے۔ اسی لئے لامارک کے پیرو ڈارون سے مختلف خیال رکھتے ہیں اور برنارڈ شا نے تو ڈارون کو کافی بُرا بھلا کہا ہے۔ حتیٰ یہ کہ اسے سولی کے مستحق سمجھتا تھا۔

ابھی حال ہی میں برگساں کے بعد ڈارون ازم کی روشنی پھیکی پڑ گئی ہے۔ یہی حال نیوٹن کا ہے۔ آئین سٹائن کی تصوریت نے نیوٹن کے بہت سے خیالات کو غلط ثابت کیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن سے ان غلط خیالات، مشکوک نظریات اور مشتبہ تھیوریوں کی تصدیق کا کام لینا اس کا بدترین استعمال ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ سائنس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ جہاں تک علم سائنس کے نفسی پہلو کا تعلق ہے اس میں آج تک کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہوئی ہے اور نہ ہوگی جو قرآن کے مخالف ہو۔ البتہ سائنس کا قیاسی نظریاتی پہلو جو ہر دور میں ادلتا بدلتا رہتا ہے اور جو کتاب و سنت کے خلاف جا سکتا ہے اس میں اور کتاب و سنت میں نہ مطابقت دی جا سکتی ہے اور نہ اس کوشش میں وقت ضائع کرنا

چاہیئے۔ یہ راہ بڑی پُرخطر ہے۔

علامہ مشرقی اور ان کے ہم نواؤں کی اس علمی جدوجہد کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشادات واقعی خوب ہیں۔ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ :-

"آج کل ہندوستان اور مصر کے بعض دانش فروشوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جو خود انہی کے لفظوں میں یہ ہے کہ زمانہ حال کے "اصول علم و ترقی" قرآن سے ثابت کیئے جائیں۔ یا بقول ان کے فلسفہ و سائنس اس کی ہر آیت میں بھر دیا جائے گویا قرآن صرف اسی لیئے نازل ہوا تھا کہ جو باتیں کوپرنیکس اور نیوٹن نے یا ڈارون نے اور ڈیمس نے بغیر کسی الہامی کتاب کے اپنی فلسفہ اندیشیوں کے ذریعے دریافت کر لی ان باتوں کو چند صدی معموں اور پہیلیوں کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے اور پھر وہ صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئیں اور اب موجودہ زمانے کے مفسر پیدا ہوئے اور وہ تیرہ سو برس پیشتر کے معمے حل فرما رہے ہیں۔"

ان لوگوں سے مخاطب ہو کر مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں :-

"تم صحیح علم کی ایک ذرا سی نمود دیکھ کر مرعوب ہوتے ہو اور چاہتے ہو کہ قرآن کو فوراً اس کی جگہ سے ہٹا دو۔ لیکن اگر تم جلدی نہ کرو تو قرآن کو ہلنے کی ضرورت کبھی نہ ہوگی جلد یا بدیر علم اپنی جگہ چھوڑے گا اور آگے بڑھ کر قرآن کی تصدیق کرے گا۔"

علامہ مشرقی کے اس نظریئے پر کہ "قرآن و سائنس کو ہم آہنگ کیا جائے" یہ بہترین تبصرہ ہے اور حیرت تو اس پر ہے کہ اس نظریہ کا کھوکھلا پن اہل علم اور ارباب فکر پر پوری طرح ظاہر ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی کچھ ایسے لوگ مسلمانوں میں اب تک پائے جاتے ہیں جو اس نظریہ کو درست مانتے ہیں۔ اور اپنی ضد پر قائم ہیں۔

علاوہ ازیں علامہ مشرقی صاحب کا یہ فرمانا کہ ملت کو پرانے اوزار عمل خیر باد کہہ کر نئے اوزار عمل اختیار کرنے چاہئیں اور قدیم شریعت کو ترک کر کے اپنے لیئے نئی شریعت تشکیل دینا ہوگی کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ اوزار عمل قیامت تک ناکارہ و فرسودہ نہیں ہوں گے اور دین کے ساتھ اس

کا اوپری خول اور لباس بھی ضروری ہے۔ کیونکہ وہ اس میں جڑا ہوا اور محفوظ ہے ؎

ما ز قرآں مغز را برداشتیم   استخواں پیش سگاں انداختیم!

کے رجحان کو ملتِ اسلامیہ نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا کہ قرآن اپنے الفاظ و ومعانی کے اعتبار سے سراپا مغز دجوہری واقع ہوا ہے۔ اس کا ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جس کے معنی سے کوئی "مغز" کو چن لے اور استخواں نااہلوں کے لئے چھوڑ دے۔

درحقیقت زمانۂ گذشتہ اور زمانہ موجودہ میں بھی وہ لوگ جو باطل نظریات کے سحر میں گرفتار ہوکر اسلام کے بارے میں یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اسلام کا پرانا اڈیشن چل نہیں سکتا اور ہمیں اس کا ایسا نیا اڈیشن نکالنا چاہیئے جو من بھاتا ہو وہ دین کی عقلی تعبیر اور شریعت میں اجتہاد کے نام پر ایک بالکل نیا اسلام وضع کرنا چاہتے ہیں جس کا ماضی کے اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن اس طرح کے مجددین پرانے زمانے میں بھی ناکام رہے ہیں اور آج بھی ناکام ثابت ہو رہے ہیں کیونکہ اسلام پر حقیقی ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسی تہذیب پیدا کی جائے جو اسلامی اقدار کے مطابق ہو اور اسلام کو عصرِ حاضر کی کسی تہذیب کے سند اور جواز کے لئے استعمال کرنا یا اس کا تابع ہونا اسلام کی خدمت نہیں بلکہ اسلام سے انحراف ہے۔

بقیہ "دو جدید الہیاتی مفکرین کا تقابلی جائزہ"

جس پر انتہائی پر مغز اضافہ کیا حضرت علیؓ نے اپنے اس قول میں۔ والبحث عن کنہ الذات اشراکٌ اسی حقیقت کو حضرت اکبر الہ آبادی نے انتہائی سادہ الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

لطف الرحمان خاں

جہاد فی سبیل اللہ
اور ہماری ذمّہ داریاں

ایک مرتبہ کچھ صحابہؓ کرام آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ایک کا خیال تھا کہ اسلام لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے سے زیادہ کوئی عبادت نہیں۔ دوسرے نے کہا کہ اسلام کے بعد بہترین عمل مسجد حرام کی خدمت ہے (مثلاً جھاڑو دینا یا روشنی وغیرہ کرنا)۔ کسی نے کہا کہ جہاد فی سبیل اللہ تمام عبادات و اعمال سے افضل و اشرف ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں ٹوکا کہ تم لوگ جمعہ کے وقت منبر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بیٹھ کر اس طرح بحث کر رہے ہو۔ ذرا صبر کرو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے فارغ ہو جائیں گے تو آپؐ سے یہ چیز دریافت کر لی جائے گی۔ چنانچہ جمعہ کے بعد حضورؐ سے سوال کیا گیا تو مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں[1]

> "کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کا بسانا اس کے برابر کر دیا جو ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں۔ اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں ہیں۔ اور اللہ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو ○ جو ایمان لائے اور (جنہوں نے) ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے، ان کے لئے اللہ کے پاس بڑا درجہ ہے۔ اور وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں ○" (سورۃ توبہ۔ آیت ۲۰۔ ۱۹)

صحابہ کرامؓ کے درمیان جو مسئلہ زیر بحث تھا اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بالکل صاف اور دو ٹوک ہے۔ اس کے باوجود ان آیات میں چند باتیں غور و فکر کی

---

[1] بحوالہ صحیح مسلم۔ منقول از ترجمہ شیخ الہند۔ تفسیر آیت متعلقہ۔

متقاضی اور وضاحت طلب ہیں۔ جس کے بغیر امکان ہے کہ ایک عام مسلمان مجاہد کے اس "درجہ اعظم" تک نہ پہنچ سکے جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ سے قبل ایمان باللہ اور ایمان بالآخرہ کا ذکر کیوں کیا گیا؟ ظاہر ہے کہ جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے وہ اللہ کو بھی مانتا ہے اور آخرت کو بھی۔ اس لئے سرسری طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ الفاظ زیب داستان کے طور پر آئے ہیں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں کوئی لفظ بے محل اور بے مقصد نہیں ہے۔ اس نقطہ نظر سے جب ہم ان الفاظ پر غور کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ دراصل پیشگی شرائط (PRE- REQUISITES) ہیں جن کو پورا کئے بغیر کسی مجاہد کو اللہ تعالیٰ کے پاس "درجہ اعظم" نہیں ملے گا۔

پہلی شرط یہ ہے کہ ایمان اللہ پر ہی ہو۔ یعنی اجر کی توقع اللہ کے سوا کسی اور سے نہ ہو۔ نہ امیر تنظیم سے، نہ حاکم وقت سے اور نہ ہی عوام الناس سے داد و تحسین کی شکل میں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ایمان آخرت پر ہو۔ یعنی اللہ سے جس اجر کی توقع ہے اس کی طلب، اس کے لئے تڑپ آخرت کے لئے ہو، دنیا کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ یہاں جو کچھ ملے گا وہ یہیں رہ جائے گا اور آخرت میں عنداللہ بلندی درجات کا موجب نہیں ہو گا جو مجاہد ان شرائط کو پورا کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا اس کے نصیب میں وہ "درجۂ اعظم" ہے جس کا ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ لوگوں کے لئے پانی کا انتظام کرنا اور مساجد کی خدمت کرنا عام قسم کے صالح اعمال میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ بہترین صدقہ جاریہ ہیں۔ گویا نفلی عبادات ذکر، ورد اور تسبیحات سے ان کا مقام بلند تر ہے۔ پھر ان کا بھی بلند ترین درجہ یہ ہے کہ پانی کا انتظام عام لوگوں کے لئے نہیں بلکہ حجاج کرام کے لئے کیا جائے۔ اور عام مساجد کی نہیں بلکہ مسجد حرام کی خدمت کی جائے۔ جو

لوگ یہ کام کرتے ہیں، ذرا سوچئے کہ وہ کتنے عظیم المرتبت لوگ ہیں۔ اب پھر غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنے عظیم المرتبت لوگوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا ہے کہ مجاہد کا رتبہ اس کے پاس ان لوگوں سے کہیں زیادہ ہے۔

پھر آیت نمبر ۱۹ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ضروری ہے کہ اس مقام پر اس ارشاد کے مفہوم کا تعین کر لیا جائے۔ ورنہ ہم اس ہدایت سے محروم رہ جائیں گے جو اس ارشاد ربانی میں مضمر ہے۔ یہاں پر ظالمین سے مراد بے موقع کام کرنے والے[۱] ظلم کا اصل مفہوم ہے کسی چیز کو بے موقع رکھنا ہے[۲] کسی چیز کو اس کے لئے معین مقام پر نہ رکھنا۔ خواہ کمی یا زیادتی کر کے یا اسے اس کے صحیح وقت یا اصلی جگہ سے ہٹا کر[۳] اس طرح ظلم کے دو پہلو ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کسی چیز کو اس کے اصل سے برتر مقام دے دینا۔ دوسرے یہ کہ اصل سے کم تر مقام دینا۔ ظلم کے اس مفہوم کو ذہن میں رکھ کر ارشاد ربانی پر اس مسئلہ کے پس منظر میں غور کیجئے جو صحابہ کرام کے درمیان زیر بحث تھا تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نوافل، ذکر، ورد اور تسبیحات کا اہتمام کرنا اور صدقہ جاریہ کے کاموں میں حصہ لینا نیک اعمال ہیں لیکن ان میں انہماک اگر اس درجہ بڑھ جائے کہ ہم جہاد کے فرض کو بھول جائیں تو یہی ظلم ہے اور جو ایسا کرے وہی ظالم ہے۔ بخارا پر جب تاتاریوں نے حملہ کیا تو اس آفت سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہاں کے علماء کرام نے مسجد میں جمع ہو کر بخاری شریف کی تلاوت کا اہتمام کیا۔ بخاری شریف کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس کا جو بے موقع استعمال بخارا کے علماء نے تجویز کیا تھا وہ بلاشبہ ظلم ہی کے ذیل میں آتا ہے۔

اسی تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ کوئی شخص جہاد فی سبیل اللہ کے فرض میں سرگرم ہے اور اپنے فرض کی عظمت کے زعم میں اس نے نوافل، ذکر، ورد، تسبیح اور صدقہ

لے ترجمہ شیخ الہند۔ تفسیر آیت مذکورہ۔ سے مفردات القرآن [illegible]

سے منجد ص ۶۴۴۔

جاریہ کے کاموں سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کرلی ہے یا وہ ان کاموں کو اور یہ کام کرنے والوں کو حقیر سمجھ رہا ہے تو وہ بھی ظلم کر رہا ہے۔ وہ اپنے رب کی اس ہدایت کو بھول رہا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ہم تک پہنچی ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مخاطب فرما کر ہدایت دی ہے کہ جب آپؐ (اپنے فرائض منصبی سے) فارغ ہو جایا کیجئے تو ریاضت کیا کیجئے اور اپنے رب ہی کی طرف توجہ رکھئے[1] اس طرح ہمیں اور خاص طور سے ایک مجاہد کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ہر کام کا اپنا اپنا مقام ہے اور ان کے کرنے کا ایک موقع اور محل ہے۔ ہر کام کو اپنے اپنے موقع اور محل پر سرانجام دینا ہی اعتدال کی راہ ہے۔ صراط مستقیم ہے اور جہاد فی سبیل اللہ جیسے عظیم فرض کی ادائیگی میں منہمک ہو کر اگر کوئی شخص ذکر اللہ اور تعلق اللہ کی اہمیت سے بالکل غافل ہو جاتا ہے تو وہ بھی ظلم کرتا ہے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ جہاد کا مطلب کیا ہے۔ ہمارا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ ہم نے جہاد کو قتال کا ہم معنی قرار دے لیا اور پھر اپنی غلطی پر اڑ گئے۔ جس کے نتیجے میں بحیثیت امت ہم اپنا فرض منصبی گم کر بیٹھے۔ راہی جب اپنی منزل کی شناخت گم کر دیتا ہے تو اس میں اور کٹی پتنگ میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ دونوں ہی تھپیڑوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ آج امت کا بالکل یہی حال ہے۔

جہاد کو قتال کا ہم معنی قرار دینے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ایک عام مسلمان جہاد کا جذبہ رکھنے کے باوجود اس پر عمل نہیں کر پاتا کیونکہ اس کی پہلی شرط تو یہ ہوئی کہ کسی کافر ملک سے جنگ ہو اور جب جنگ ہو بھی جائے تو اس سے استفادہ صرف فوجی کر سکتے ہیں۔ اس لئے ایک عام مسلمان صبر کر لیتا ہے کہ یہ سعادت اس کی پہنچ سے باہر ہے۔ اس کے بعد اگر قرآن اور احادیث میں وہ جہاد کی عظمت اور اس کے اجر و ثواب کا بیان پڑھتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہے۔ اس میں عملی حصہ لینے کا خیال اور اس کے فرض عین ہونے کا احساس دل و دماغ کے کسی

---

[1] سورۃ الم نشرح۔ آیت نمبر ۸

گوشے میں آئے تو کہاں سے آئے' کھڑکیاں تو ساری بند ہیں اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے ایک بظاہر بڑی معصوم سی غلطی کا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاد کے وسیع مفہوم کو قتال کے کوزے میں بند کر دینا اپنی جگہ ایک ظلم ہے اس لئے آیت زیر مطالعہ سے عملی ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جہاد کا مفہوم ہمارے ذہن میں پوری طرح واضح ہو۔

جہاد کا لفظ جہد سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کوشش۔ جدوجہد کا لفظ اردو میں عام استعمال ہوتا ہے۔ یہی جہد کا لفظ جب جہاد اور مجاہدہ کی شکل اختیار کرتا ہے تو اس میں دو اضافی مفہوم شامل ہو جاتے ہیں۔ یعنی کوشش میں ایک سے زیادہ فریق کی شرکت اور ایک فریق کا دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے لئے کشمکش کرنا۔ جہاد کے اس مفہوم کو ذہن میں رکھ کر غور کیجئے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے عملی تقاضے کیا ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق افضل جہاد یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے۔ یعنی اپنی خواہشات اور پسند ناپسند کے ساتھ کشمکش کر کے ان پر اپنی برتری قائم کرے اور انہیں حدود اللہ کے تابع کرے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ کا پہلا مرحلہ ہے۔ یعنی "درجہ اعظم" تک رسائی کی سیڑھی کا پہلا زینہ اور اس میدان میں کسی حد تک کامیابی حاصل کئے بغیر اگلے مرحلہ میں قدم رکھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اگلے مراحل میں کامیابی کا انحصار براہ راست اس بات پر ہے کہ اپنے نفس کے خلاف جہاد کے میدان میں کتنی کامیابیاں حاصل کی جا چکی ہیں۔ شاید اسی لئے اسے افضل جہاد قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مرحلہ آتا ہے دعوت و تبلیغ اور نظریہ اسلام کی نشر و اشاعت کا پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا۔ اور جہاد کی آخری منزل ہے اللہ کے دین کو زمین پر عملاً رائج اور غالب کرنے کی جدوجہد کرنا۔ اس مرحلہ پر اگر جنگ و جدال کی نوبت آ جائے تو پھر قتال فی سبیل اللہ میں حصہ لینا جو درحقیقت جہاد ہی کی ایک انتہائی شکل ہے۔[1]

---

[1] لیکچر کے کیسٹ نمبر ۲۲ جہاد فی سبیل اللہ سے ماخوذ۔

اب ہمیں تھوڑا بہت اندازہ ہو جانا چاہئے کہ جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح کتنی وسیع اور ہمہ گیر ہے جبکہ قتال فی سبیل اللہ اس کا ایک جز ہے اور چوٹی کی منزل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ ہم ان دونوں اصطلاحوں کو گڈمڈ کر کے اپنے فرائض منصبی سے پہلوتہی کریں گے اس لئے قرآن میں جہاں جنگ کے متعلق ہدایات یا تاکید مقصود ہے وہاں جہاد کے بجائے قتال کا لفظ آیا ہے۔ اس کے باوجود ہم یہ غلطی کر بیٹھے۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ ہم قرآن کی تلاوت سے ثواب تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن قرآن کو سمجھ کر اس سے ہدایت حاصل نہیں کرتے۔

اب یہ بات سمجھ میں آجانی چاہئے کہ جہاد کا ثواب حاصل کرنے کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ کسی کافر ملک کے ساتھ جنگ ہو اور ہم فوج میں بھرتی ہوں بلکہ یہ تو مسئلہ ہے اس جدوجہد اور کشمکش میں شرکت کا جو ہر فرد کی ذات میں، ہر گھر میں، زندگی کے ہر موڑ اور ہر ہر قدم پر پورے شدومد کے ساتھ جاری ہے۔ اس میں شرکت ہر وقت عملی طور پر ممکن ہے اور ہر فرد کی دسترس میں ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ کو ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا ہے[1]

جہاد کے وسیع اور ہمہ گیر مفہوم کو ذہن میں رکھتے ہوئے آیئے سوچتے ہیں کہ آج کے دور میں اس میں شرکت کی عملی صورتیں کیا ہیں۔ اپنے نفس کی خواہشوں کے خلاف جہاد کرنے کے لئے اللہ کے احکام کا علم حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ اسطرح گویا قرآن وحدیث کا علم حاصل کرنا بھی جہاد ہے اور اس پر عمل پیرا ہو کر اس کی تعلیم دینا بھی جہاد میں شامل ہے۔ دعوت وتبلیغ کے مرحلہ میں غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینا یقیناً جہاد ہے لیکن اس وقت اس دعوت کے زیادہ حقدار ہم جیسے "خاندانی مسلمان" ہیں۔ ان کے ذہنوں میں دیگر نظریہ ہائے حیات کے مقابلے میں اسلام کے نظریہ کی برتری کو جاگزیں کرنا دور جدید کے باطل نظریات کی "شمشیر قرآنی" کے ذریعے مکمل تردید کرنا اور ان کی جگہ صحیح قرآنی فکر پیش کرنا، اور پھر اسلامی نظریہ کی

---

[1] سورۃ الحجرات آیت نمبر ۱۵۔

برتری تسلیم کرنے والوں کو " کافی ہاؤس اسلام " سے آگے "عملی اسلام " کی طرف راغب کرنا۔ اس کے لئے ان کی رہنمائی اور مدد کرنا۔ یہ بھی جہاد ہے۔ اسلامی نظریہ کی برتری ثابت کرنے کی غرض سے جدید اور دینی علوم حاصل کر کے تحقیقی کام (RESEARCH WORK) کرنا۔ اس قسم کا علم اور تحقیقی کام کی تربیت دینے والے اداروں تک باصلاحیت افراد کو پہنچانا۔ اس کے لئے ان کو ترغیب دینا، رہنمائی کرنا، مدد کرنا، یہ سب جہاد ہے۔ ٹھوس حقیقی مواد اور بزرگوں کے تحقیق شدہ کاموں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا۔ اس کے لئے کتابت، طباعت اور اشاعت کا کام کرنا..... درس قرآن اور قرآنی موضوعات پر مشتمل لیکچرز کے آڈیو اور وڈیو کیسٹ تیار کرنا وغیرہ یہ تمام کام " جہاد باالقرآن " میں شامل ہیں۔ اس لئے کہ اس سطح پر جو مجاہدہ بھی ہو گا اس میں ہمارے لئے جو چیز ہتھیار کا کام دے گی وہ خود قرآن ہے۔ سورت فرقان میں " جہاد باالفرقان " کی اصطلاح وارد ہوئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا فلا تطع الکفرِ یْنَ وَ جَاھِدھُمْ بِہٖ جِہادا کبیرا ۔

یہ فہرست بہت طویل ہے۔ ان چند مثالوں سے یہ بتانا مقصود تھا کہ ان خطوط پر اگر غور کیا جائے تو بے شمار کام ہیں جو جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں آتے ہیں اور جن کو سرانجام دینے کی ضرورت بڑی شدید ہے۔ اس کے لئے ضرورت تو وسائل اور افراد دونوں کی ہے لیکن آج کے دور میں وسائل سے زیادہ ضرورت باصلاحیت افراد کی ہے جن کی کم یابی دن بدن سنگین رکاوٹ بنتی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم جب اللہ کی کسی ہدایت پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں تو بھی ہدایت کو پوری طرح سمجھے بغیر چل پڑتے ہیں۔ آیت نمبر ۲۰ کا ترجمہ ایک مرتبہ پھر دیکھ لیجئے۔ وہاں یہ ہدایت بہت واضح ہے کہ اس جدوجہد میں اپنا مال بھی کھپاؤ اور اپنی جان بھی..... یعنی مال کے ساتھ اپنی صلاحیت، اپنی توانائی اور اپنا وقت بھی صرف کرو اور اگر کبھی ضرورت پڑ جائے تو اس کشمکش میں جان کا نذرانہ بھی پیش کر دو۔ لیکن ہم میں اکثریت ان لوگوں کی ہے

جو اس راہ میں چندہ دیگر خود کو سبکدوش سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یہ لوگ ان سے تو بہر حال بہتر ہیں جو اس کشمکش میں سرے سے حصہ ہی نہیں لیتے لیکن ان آیات میں مجاہد کے لئے جس "درجہ اعظم" کی خوشخبری دی گئی ہے اس کے حصول کے لئے صرف چندہ دینا کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم مال کے ساتھ اپنی جان بھی کھپائیں۔ اس کے لئے تارک الدنیا ہونا ضروری نہیں ہے۔ صرف روزمرہ کے نظام الاوقات کی بہتر تنظیم کر کے ہر شخص کچھ نہ کچھ وقت نکال سکتا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں عملی شرکت کر سکتا ہے۔

اب یہ بات سمجھ میں آ جانی چاہئے کہ جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت ایک ایسی سعادت ہے جو ہر مسلمان کی دسترس میں ہے اور قطعی طور پر قابل عمل ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی مسلمان اپنا یہ فرض ادا نہیں کرتا تو اس کا شمار دین کے ایک انتہائی تاکیدی حکم کو ترک کرنے والوں میں ہو گا۔ اور اگر کوئی مسلمان اپنی استطاعت کے مطابق اس فرض میں اس نیت سے شریک ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی مدد اور توفیق سے وہ اگلے مراحل میں بھی قدم رکھے گا او ر ساتھ ہی وہ ان پیشگی شرائط کو بھی پورا کرتا ہے جن کی وضاحت آیات زیر مطالعہ میں موجود ہے تو پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا درجہ (STATUS) حاجیوں کو پانی پلانے والے اور مسجد حرام کی خدمت کرنے والے جیسے عظیم المرتبت لوگوں سے بھی کہیں زیادہ ہو گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد۔

******

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

لطف الرحمان خاں

دُھندلے سائے

اراکینِ انجمن کی خدمت میں چند گزارشات

ہماری مجلس منتظمہ کے رکن جناب ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب نے انجمن کے سالانہ اجلاس عام میں حاضرین کی توجہ ایک انتہائی اہم بات کی جانب مبذول کرائی تھی اس کی اہمیت کے پیش نظر وہ بات تمام وابستگان انجمن کے سامنے پیش کی جارہی ہے

ڈاکٹر خواجہ صاحب نے فرمایا کہ انجمن کے مشن کو آگے بڑھانے کی جدوجہد میں عملی حصہ لینے والے وابستگان کی تعداد بہت قلیل ہے زیادہ تر لوگ اپنا چندہ دے کر اور اجتماعات میں شرکت کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے انجمن سے وابستگی کا حق ادا کر دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں بعض اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ انجمن 'ONE MAN SHOW' ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انجمن کا مشن اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک اس کے لئے عملی جدوجہد میں ہر فرد اپنا حصہ نہ ڈالے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہم سب لوگ یاد کرنے کی کوشش کریں کہ اس انجمن کے قیام کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ اس کا مشن کیا ہے؟ اور ہم اس سے کیوں وابستہ ہوئے تھے؟

ان سطور میں ہماری کوشش ہوگی کہ جو باتیں آپ کے ذہن میں دھندلا گئی ہیں انہیں واضح کر کے ایک مرتبہ پھر سے اجاگر کر دیں۔ انجمن کے قیام کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ اس کا جواب صدر مؤسس کا کتابچہ "اسلام کی نشاۃ ثانیہ..... کرنے کا اصل کام" میں موجود ہے۔ ہماری گذارش ہے کہ کہ تمام وابستگان انجمن اس کا مطالعہ ایک مرتبہ پھر کر لیں اگر کسی رکن نے اس کا مطالعہ نہیں کیا ہے تو یہ اس کی فوری اور ناگزیر ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کے تحت جون ۸۷ء کے شمارہ میں یہ مکمل کتابچہ دوبارہ شائع کیا جا چکا ہے۔

اس کتابچہ میں صدر مؤسس مختلف تاریخی عوامل اور خصوصاً ماضی قریب میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اٹھنے والی تحریکوں کے غیر مؤثر ہو جانے کی وجوہات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ احیائے اسلام کی شرط لازم تجدید ایمان ہے۔ اقرار باللسان والا زبانی کلامی ایمان اس مقصد کے لئے کفایت نہیں کرتا اس نوع کے اصحاب ایمان تو کروڑوں بلکہ اربوں کی تعداد میں موجود ہیں تجدید تو تصدیق قلبی والے ایمان کی درکار ہے اس لئے کہ حقیقی ایمان یہی ہے۔ یہ تجدید موعظہ حسنہ کے ذریعے جذبات کو اپیل کر کے بھی کی جا سکتی ہے اور کی جا رہی ہے لیکن اس سے معاشرہ کا وہ طبقہ متأثر نہیں ہوتا جن کے یہاں جذبات پر عقل اور عمل پر علم کو اوّلیت حاصل ہے۔ "ایسے لوگ اپنی ذہنی ساخت کی بناء پر مجبور ہوتے ہیں کہ عقل کی جملہ وادیاں طے کر کے عشق کی وادی میں قدم رکھیں اور خرد کی تمام گتھیاں سلجھانے کے بعد صاحب جنون ہوں۔ پھر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسی قسم کے لوگ ہر دور اور ہر معاشرہ کی وہ ذہین اقلیت (INTELLECTUAL MINORITY) ہوتے ہیں جو از خود معاشرہ کی رہنمائی کے منصب پر فائز ہوتے ہیں اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے نقطہ نظر میں تبدیلی اور ان کے فکر و نظر میں انقلاب کو اوّلین اہمیت حاصل ہے۔ اگر خدانخواستہ ایمان ان لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہو سکا تو صرف عوام الناس کے قلوب و اذہان کی تبدیلی سے کسی مؤثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی"۔

"بنا بریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اٹھے جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات اور معاشرہ کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے" ..... "خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلل اثبات اور الحاد و مادہ پرستی کے پرزور ابطال کے بغیر اس مہم کا سر ہونا محال ہے" ..... "پیش نظر علمی تحریک کے لئے سب سے پہلے ایسے ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کو تلاش کرنا ہو گا جن میں علم کی ایک شدید پیاس فطری طور پر موجود ہو" ..... "ایسے نوجوانوں کو اولاً انسان کی آج تک کی سوچ و بچار کا کھلا جائزہ لینا ہو گا۔ اور اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ انسانی فکر کی پوری تاریخ کا

گہرا مطالعہ کریں۔ اس اعتبار سے منطق ' ماوراء الطبیعات ' نفسیات ' اخلاقیات اور روحانیات ان کے مطالعہ اور غور و فکر کا اصل میدان ہوں گے۔ اگرچہ ضمنی طور پر عمرانیات اور طبیعات کی ضروری معلومات کی تحصیل بھی ناگزیر ہوگی ' فکر انسانی کے اس گہرے اور تحقیقی مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ وحیٔ آسمانی اور اس کے آخری جامع ایڈیشن یعنی قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ حقیقت کی تلاش کے نقطہ نگاہ سے کریں "۔

" متذکرہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لئے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں۔ ایک یہ کہ (قرآن کی) عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاح اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کرے۔ "

مختصراً یہ وہ منفرد فکر ہے جس نے انجمن کی ضرورت کا احساس پیدا کیا اور اس کی بنیاد پر انجمن کے اغراض و مقاصد معین ہوئے۔ چونکہ یہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ ہمارے ایمان و یقین کا سرچشمہ قرآن ہے۔ اس لئے تجدید ایمان کا کام بھی قرآن کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اور جب تک قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے اور اعلیٰ علمی سطح پر تشہیر و اشاعت نہیں ہوگی اس وقت تک امت مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدید ایمان کی وہ عمومی تحریک برپا نہ ہوگی۔ جس کے ذریعے ہم ایسے باصلاحیت افراد تلاش کرنا چاہتے ہیں جن کی تعلیم و تربیت کر کے ہم ان کے سپرد وہ علمی تحقیقی کام کر سکیں جس سے مغرب کے فلسفہ و فکر کا ابطال اور اس کی تہذیب و تمدن کا حقیقی استحصال ممکن بھی ہے اور ہمارا ہدف بھی۔

قرآن حکیم کی عمومی دعوت و تبلیغ کی حقیقی غرض و غایت واضح ہو جانے کے بعد آپ ہم سے اتفاق کریں گے کہ یہ کام صرف اس صورت میں سرانجام دیا جا سکتا ہے جب انجمن کا ہر رکن اپنے اپنے حلقہ میں کچھ نہ کچھ عملی کام کرے اس ضمن میں جو عملی اقدامات بآسانی کئے جا سکتے ہیں ' ان کی وضاحت سے قبل مناسب ہو گا اگر ہم ایک بات ذہن نشین کر لیں۔ عربی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی قرآن کے ساتھ ہمارا ذہنی رشتہ بھی منقطع ہو گیا اور صرف قلبی تعلق باقی رہ گیا۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے قرآن کے اردو ترجمہ اور تفسیر کا اہتمام کیا گیا۔ ابتداً

یہ قابل قدر کوششیں عام فہم نہ تھیں لیکن اب عام فہم ترجمے اور تفاسیر بھی دستیاب ہیں۔ اس طرح قرآن کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں حائل ایک بڑی رکاوٹ دور ہو چکی ہے اور اس ضمن میں ہماری ذمہ داری اور جوابدہی بھی اسی تناسب سے بڑھ گئی ہے۔ پھر قرآن آڈیٹوریم کی تکمیل ہوتے ہی صدر مؤسس کے ترجمہ قرآن کے آڈیو اور وڈیو کیسٹ بھی آنا شروع ہو جائیں گے جس سے مزید آسانی پیدا ہو جائے گی۔ اور ہماری ذمہ داری میں بھی اضافہ کر دے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے فرض کا احساس کریں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق تیاری کر لیں۔

اب آیئے ان عملی اقدامات کا جائزہ لیں جن کے ذریعہ ہم جہاد فی سبیل اللہ کے ایک پہلو یعنی جہاد بالقرآن میں عملی حصہ لے سکتے ہیں۔

(۱) سب سے اہم ضرورت اس بات کی ہے کہ جن وابستگان انجمن نے خود قرآن حکیم کا ترجمہ و تفسیر سے مطالعہ نہیں کیا ہے وہ اس کا اہتمام کریں۔ یہ کوئی اتنا بڑا کام نہیں ہے جتنا شروع میں نظر آتا ہے۔ ترجمہ و تفسیر کے دس صفحات کا مطالعہ کرنے میں ۲۵ سے ۳۵ منٹ لگتے ہیں۔ اگر ہم روزانہ کے ۲۴ گھنٹوں میں سے صرف آدھا گھنٹہ اس کام کے لئے وقف کر دیں تو پانچ چھ جلدوں پر مشتمل تفسیر ایک سال کے اندر اندر آسانی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ ہر ہفتہ ڈیڑھ، دو دن کی چھٹیوں میں اگر ہم زیادہ وقت صرف کریں تو صرف چھ سات ماہ میں یہ کام مکمل ہو جاتا ہے۔

(۲) اس کے بعد بہتر یہی ہے کہ ہم عربی گرامر پڑھیں۔ اپنے محلّہ یا شہر کے کسی بھی عربی دان سے رابطہ کر کے اس کی تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ روزانہ ایک گھنٹہ کی تعلیم اور ایک گھنٹہ کے ہوم ورک سے ایک سال کے اندر اندر آپ عربی دان تو نہیں بن جائیں گے لیکن قرآن کو ترجمہ کی مدد کے بغیر سمجھنے کی استعداد حاصل ہو جائے گی۔ پھر نمازوں میں اور بالخصوص تراویح میں روح قرآن تک رسائی کی جو کیفیت آپ پر طاری ہوگی اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتے ہیں جنہیں اللہ نے یہ نعمت عطا کی ہے۔

(۳) اگر فی الحال عربی پڑھنا آپ کو مشکل معلوم ہوتا ہے تو اس کام کو اس وقت تک

ملتوی کر دیں جب تک آپ کی طبیعت اس پر آمادہ نہ ہو۔ سردست اس کے بجائے دینی کتب کا مطالعہ کریں اور کیسٹیں سنیں۔ بالخصوص ٹی۔ وی کے مشہور پروگرام " اھدٰی " کے ۴۴ کیسٹوں کا سننا بہت مفید ہو گا۔

(۴) اپنے مزاج میں دین کے ساتھ علمی اور عملی سطح پر ایک بنیادی مناسبت پیدا کرنے کے بعد ہی آپ اس قابل ہو سکیں گے کہ دعوت و تبلیغ کے میدان میں پہلا قدم رکھ سکیں اور اس کے بعد ہی سننے والے آپ کی بات میں کچھ وزن محسوس کریں گے۔ اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ انفرادی طور پر ایک ایک فرد سے سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کر کے اسے مطالعہ قرآن اور مطالعہ دین کی دعوت دیں۔ اس کام کے دوران لوگوں کے طنز و مزاح کی وجہ سے جب کبھی آپ کے دل میں مایوسی کی کیفیت پیدا ہو تو اس وقت دو رکعت نفل قضائے حاجت پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے مدد و رہنمائی مانگیں، اپنی تحریر و تقریر میں تاثیر مانگیں، صبر و استقامت کی توفیق طلب کریں اور بالخصوص اس راہ کی گمراہیوں اور ضلالتوں سے بچنے کے لئے شیطان کی وسوسہ اندازیوں سے اللہ کی پناہ مانگیں۔ اس لئے کہ جیسے ہی اللہ کا کوئی بندہ اس راہ میں قدم رکھتا ہے شیطان اسے اپنی وی آئی پی لسٹ پر لے آتا ہے۔

(۵) اگر ممکن ہو تو کیسٹوں اور کتب پر مشتمل اپنی ذاتی لائبریری قائم کریں ورنہ چند شرکاء کے تعاون سے اجتماعی لائبریری قائم کریں اور جو لوگ آپ کی دعوتِ مطالعہ پر لبیک کہیں اور انہیں اس کا ممبر بنائیں۔

(۶) اپنے حلقہ میں ایسے افراد تلاش کریں جو قرآن کا درس دے سکتے ہوں اور پھر درس قرآن کا حلقہ قائم کریں۔ ان دروس میں خود اس ذہن کے ساتھ شرکت کریں کہ تحصیل علم، مطالعہ اور ان دورس کے مشاہدہ سے آپ میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ ایک دن آپ بھی قرآن کا درس دے سکیں۔

(۷) دینی لٹریچر کے مطالعہ کو آسان اور دلچسپ بنانے کے لئے اسٹڈی سرکل قائم کریں۔ درس قرآن اور اسٹڈی سرکل کی نشست اگر لائبریری میں ہو تو زیادہ مفید ہو گی۔

(۸) ہمارے لٹریچر کے مطالعہ کے بعد جو لوگ ہماری فکر سے متفق ہوں انہیں انجمن سے

وابستہ کریں۔

(۹) قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج کے کورسوں میں شمولیت کے لئے اپنے حلقۂ اثر میں نوجوانوں کی ہمت افزائی اور رہنمائی کریں۔

(۱۰) حکمت قرآن اور میثاق ایک ایک سال کے لئے اپنے عزیز و اقارب، دوست، احباب اور کرم فرماؤں کے نام بطور تحفہ جاری کروائیں یا انہیں ترغیب دیں کہ وہ خود ان کے سالانہ خریدار بنیں۔ اسی طرح مکتبہ کی کتب اور کیسٹیں ان لوگوں کو تحفہ میں دیں یا ان کی خریداری کی ترغیب دیں۔

(۱۱) مذکورہ رسالوں میں خود بھی اشتہار دیں اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیں۔

اس سلسلہ میں ہماری آخری گزارش یہ ہے کہ انجمن کے وابستگان اپنے لئے مذکورہ اقدامات میں سے جو عملی قدم اپنے لئے منتخب کریں، اس سے حاصل شدہ تجربات سے ہمیں مطلع کرتے رہیں تاکہ یہ تجربات مرکز میں پول ہوتے رہیں اور ہمارے آئندہ کے پروگراموں کے لئے مشعل راہ کا کام دیں۔ ooo

---

بقیہ : منشورِ اسلام

کے اندر کوئی کمی یا نقص دریافت کر سکے۔ اس کے برعکس اسے یہ معلوم کر کے خوشی ہوتی ہے کہ اس کے نصب العین کا حسن و کمال ہر لمحہ اس سے کہیں زیادہ ثابت ہو رہا ہے جو وہ اس کی طرف منسوب کر رہا تھا۔ پھر چونکہ اس کی فطرت کا جذبۂ محبّت اس کے صحیح نصب العین کی وجہ سے نہایت آسانی کے ساتھ پوری پوری تسکین حاصل کر رہا ہوتا ہے وہ ایک گہری مسرّت اور گہرے اطمینانِ قلب سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ پھر وہ پریشانیوں اور ذہنی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کی شخصیّت نہایت ترقی یافتہ نہایت ہی مستحکم اور طاقتور اور دلیر اور باوقار ہوتی ہے۔

اسلامی عقائد و اعمال

تالیف مولانا محمد منظور الوجیدی قیمت پچاس روپے ناشر مکتبہ الافاق (رجسٹرڈ)
مین بازار مزنگ۔ لاہور ملنے کا پتہ مکتبہ الیوم ۱۹۔ مین بازار مزنگ لاہور۔

یہ ضخیم کتاب جو بڑے سائز (۹ انچ × ۶ انچ) کے ۹۷۵ صفحات پر مشتمل ہے اور نہایت صاف ستھری کتابت، اعلیٰ سفید کاغذ اور ڈائی دار خوبصورت جلد کے ساتھ سامنے آئی ہے ...... اور قیمت اتنی کم کہ نہ ہونے کے برابر۔ ایک پختہ کار اور درویش منش عالم مولانا محمد منظور الوجیدی کی تالیف ہے، جنہوں نے "قرآن و حدیث اور دوسرے مستند مراجع" سے اسے تالیف و ترتیب دیا ہے........ موصوف نے ٹائیٹل پر لکھا ہے اور بالکل صحیح کہ "راہ حق کے متلاشی کے لئے ایک جامع اور مستند کتاب"۔

اس عظیم کتاب کے ۱۴ ابواب ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔ "اسلامی عقائد، اسلامی تعلیم، اسلامی عبادات، تبلیغ اسلام، خاندانی نظام، حقوق و فرائض، اسلامی معاشرت، اخلاق عامہ کے بارے میں اسلامی تعلیمات، اسلام کا اقتصادی نظام، اسلامی خلافت، جہاد کا بیان، حدود و تعزیرات، خوشی اور غم، احسان و تصوف" گویا ایک مسلمان کے لئے زندگی کے مختلف شعبوں کے حوالے سے اس کتاب میں سب کچھ موجود ہے۔ اور بلاشبہ بنیادی اسلامی تعلیمات کا یہ انسائیکلوپیڈیا ہے جو بڑی بڑی لائبریریوں سے بے نیاز کر دیتا ہے

مولانا موصوف جید اور پختہ کار عالم ہیں قرآن و حدیث پر ان کی گہری نظر ہے، ساری عمر خدمت علم کے خاموش کوچہ میں بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ وقت گزارا اور خدمت دین و علم کو اوڑھنا بچھونا بنایا........ ان میں جدید دانشوروں والی جدت نہیں لیکن دور حاضر کی ذہنی الجھنوں سے وہ واقف ہیں اس لئے اسلوب ایسا ہے جو قدیم و جدید دونوں طبقوں کے لئے نہایت درجہ مفید و مؤثر ہے کتاب کی ایک ایک سطر پڑھ کر ان کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ نہ معلوم انہوں نے اپنی عمر عزیز کے کتنے دن اور کتنی راتیں اس کی تالیف میں بسر کی ہوں گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسا گلدستہ تیار کر دیا ہے کہ ہر مسلمان اسے حرز جان بنا سکتا ہے اور

اس سے بھرپور رہنمائی حاصل کر سکتا ہے ...... پوری کتاب میں کسی حوالہ سے شاید ہی کوئی بات ایسی نظر آئے جس کی پشت پر قرآن وحدیث اور مستند فقہی سرمایہ سے دلائل فراہم نہ کئے گئے ہوں اور ہر بات کو مدلل طور پر بیان نہ کیا گیا ہو...... اتنی بڑی کتاب میں آپ کو ایک سطر ایسی نظر نہ آئے گی جو "رطب ویابس" کے زمرہ میں آئے 'گویا مؤلف علامہ نے پورے احساس ذمہ داری اور مسئولیت آخرت کا لحاظ کر کے قلم اٹھایا ہے...... تاکہ حیات مستعار کے قیمتی لمحات اس طرح صرف ہوں کہ دونوں جہانوں کی سعادتیں میسر آسکیں

(۲)

روح القرآن

مصنف قاضی امیر حسین القادری قیمت۔/ ۱۵۰

ملنے کا پتہ ۱ ۴ شادمان کالونی بہاولپور روڈ ملتان

درمیانے سائز (۸" × ۵") کے ۷۳۰ صفحات کی یہ کتاب ہمارے سامنے ہے بلاشبہ اس کی کتابت کاغذ اور جلد بھی بہت اچھے ہیں لیکن پھر بھی قیمت زیادہ ہے جو ایسی علمی کتابوں کے لئے مناسب نہیں کہ ان کا خریدنے والا طبقہ بالعموم سفید پوش لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی قوت خرید عام طور پر کمزور ہوتی ہے...... جناب مصنف کے پیش نظر قرآن کریم کی ایک جدید تفسیر ہے جس کا خاکہ انہوں نے اس کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے 'انہوں نے سرسید احمد خان اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سے دوسرے طبقات کو آڑے ہاتھوں لیا اور ان کے افکار و نظریات پر خاصی تند و تلخ تنقید کی حتیٰ کہ قرآن وحدیث کی ٹھوس اور مخلصانہ خدمات کرنے والی بعض شخصیات اور جماعتوں کو "طلوع اسلام" سے نتھی کر دیا۔ جو صریح زیادتی ہے۔ جناب مصنف ذہنی اور فکری طور پر ارباب تصوف کے گرویدہ اور اسی کوچہ کے مسافر ہیں اس لئے قدرتی طور پر ان کے مزاج اور قلم پر ارباب سلوک کی گہری چھاپ ہے اور انہوں نے اسی حوالہ سے قرآن عزیز کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اسی نسبت سے ایک تفسیر کا خاکہ ذہن میں رکھتے ہیں کتاب میں تفہیم قرآن کا انداز بہت ہلکا پھلکا ہے البتہ بعض نکات واقعی اچھوتے ہیں جو طالبان قرآن کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں......

باقی صفحہ ۱۰۴ پر

بقیہ : درس قرآن

لیکن ابھی "حرب" (جنگ) ختم کہاں ہوئی ہے! کفر و اسلام اور حق و باطل کے آخری معرکے تو ابھی باقی ہیں۔ وہ فیصلہ کن جنگیں تو ابھی باقی ہیں جن کے بعد، حضور اکرمؐ کی پیشینگوئیوں کے مطابق، پورے کرہ ارض پر حق کا بول بالا ہو جائے گا اور باطل مکمل طور پر سرنگوں ہو جائے گا ..... اور جس طرح اس سے قبل دور نبویؐ اور دور صحابہؓ میں غلبہ دین کی راہ کی جدوجہد میں قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ آیا تھا اسی طرح آئندہ بھی یہ منزل بغیر قتال کے سر نہیں ہو گی، اس کٹھن لیکن ناگزیر مرحلے سے بہر طور گذرنا ہو گا اور پھر اس وقت محارب قیدیوں کو "مضبوطی سے باندھنے" کی ان دونوں صورتوں پر عمل وقت کی اہم ضرورت ہو گا، جن کی صراحت سیرت رسولؐ اور سیرت خلفائے راشدین سے ملتی ہے' ..... اور ان دو صورتوں میں ایک یہی ہے کہ محارب قیدیوں کو غلاموں کے طور پر اسلامی معاشرے میں تقسیم کر دیا جائے۔

یہ ہے حکمت اس معاملے کی کہ قرآن مجید میں غلامی کے ادارے (INSTITUTION OF SLAVERY) کے کامل خاتمے کا اعلان نہیں کیا گیا البتہ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ غلام صرف اسے بنایا جا سکتا ہے جو قتال فی سبیل اللہ کے نتیجے میں گرفتار ہو کر آئے۔ کسی آزاد شخص کو پکڑ کر غلام بنا لینا اور اس کی خرید و فروخت کرنا دین میں حرام مطلق ہے۔

اس آیت مبارکہ کے ایک حصے کا مطالعہ ابھی باقی ہے جو انشاء اللہ ہم آئندہ نشست میں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا صحیح فہم عطا فرمائے (آمین)

اقول قولی هذا و استغفر اللّٰه لی ولکم ولسائر المسلمین و المسلمات ooo

بقیہ : حرفِ اوّل

لونڈی غلاموں کا مسئلہ بھی دراصل اسلام کے اُن چند فروعی مسائل میں سے ہے جن پر مورچہ لگا کر پرویز صاحب نے اپنے گمراہ کن فکر کے لئے میدان ہموار کیا تھا۔ اُن کا طریق واردات یہ تھا کہ اس طرح کے فروعی اور ذیلی مسائل کے بارے میں اسلاف کے اُس منقول موقف پر تنقید کے تیر برسا کر، جو دورِ جدید کے انگریزی نظامِ تعلیم سے فیض یافتہ لیکن دینی علوم سے یکسر ناواقف شخص کے ذہن کو اپیل نہیں کرتا، ایسی فضا پیدا کر دی جائے کہ اسلاف کے علم و فہمِ قرآن پر سے عام لوگوں کا اعتماد اُٹھ جائے اور بالخصوص احادیث کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات سر اٹھانے لگیں۔ اس طرح اسلاف سے اُن کا ذہنی اعتماد کا رشتہ کاٹ دینے کے بعد اب بہت آسان ہو جائے گا کہ آپ اپنی من مانی تعبیراتِ قرآنی کے ذریعے عوام کو گمراہی کے جس کھڈ میں چاہیں جا گرائیں۔

سُورۃ محمدؐ کے درس میں آپ دیکھیں گے کہ محترم ڈاکٹر صاحب نے اُس آیت پر بڑے شرح و بسط سے گفتگو کی ہے جسے خود منکرینِ حدیث نے غلامی کے تصوّر کی تردید کے ضمن میں اپنا مؤقف و مستدل قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوبی سے اس آیت کے ذریعے اُن کے باطل افکار کی مدلّل تغلیط کی ہے۔ یہ مضمون چونکہ بالاقساط شائع کیا جا رہا ہے لہٰذا مضمون کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے بہتر ہوگا کہ گذشتہ دو اقساط کا مطالعہ بھی ضرور کر لیا جائے جو بالترتیب فروری اور اپریل ۸۷ء کے شماروں میں شائع ہوئی ہیں۔ ●●●●

بقیہ تعارف و تبصرہ

جناب مصنف سے ہماری مخلصانہ گزارش ہے کہ آئندہ ایڈیشن کی اشاعت سے قبل چند ذمہ دار علماء اور ارباب نظر سے اس پر نظرِ ثانی کرا لیں تاکہ ان کی یہ خدمت زیادہ مفید اور نافع شکل اختیار کر سکے۔

منہج انقلابِ نبویؐ کے بعد

تنظیم اسلامی کی مطبوعات میں ایک گرانقدر اضافہ

جماعت شیخ الہند

تنظیم

AUGUST 1987 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL 6
NO. 7 8

منہجِ انقلابِ نبویؐ

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی انقلاب کی

جدوجہد کے رہنما خطوط

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لیکر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسکی بین الاقوامی توسیع تک

اسلامی انقلاب کے مراحل مدارج اور لوازم

پر مشتمل

ماہنامہ "میثاق" میں شائع شدہ

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دس خطبات کا مجموعہ

قیمت : -/۲۵ روپے صفحات : ۳۷۵ (نیوز پرنٹ)

ملنے کا پتہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن (رجسٹرڈ) ۳۶ ماڈل ٹاؤن لاہور